مقامِ حدیث

احادیث کس طرح مُرتب اور جمع ہوئیں اور ہم تک کس طرح پہنچیں،
دین میں ان کی کیا حیثیت ہے اور قرآن و حدیث کا باہمی تعلق کیا ہے۔
ان مباحث کے متعلق تفصیلی گفتگو اور جامع معلومات

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

کتاب کا نام: مقام حدیث

ناشر: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
25 B گلبرک II لاہور 54660 پاکستان
فون: 576 4484, 575 3666 فیکس: 5866617
Email: trust@toluislam.com
Web: www.toluislam.com

طابع: آواز اشاعت گھر

مطبع: یمانی پریس، ریٹی گن روڈ، لاہور

پہلا ایڈیشن: 1953
دوسرا ایڈیشن: 1965
تیسرا ایڈیشن: 1975
چوتھا ایڈیشن (بلا ترمیم): 1986
پانچواں ایڈیشن (بلا ترمیم): 1992
چھٹا ایڈیشن: 2001

طلوع اسلام ٹرسٹ کی کتب سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مشمولات

مَقَامِ حَدِیْث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

طبعِ اوّل

باتیں کچھ اس طرح مشہور ہو جاتی ہیں کہ لوگ انہیں بطورِ حقیقتِ ثابتہ ماننے لگ جاتے ہیں اور اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ ان کے متعلق تحقیق کر کے دیکھ لیا جائے کہ ان کی اصلیت کیا ہے۔ اس قسم کی روش، زندگی کے عام مسائل میں بھی مستحسن نہیں قرار پا سکتی لیکن دین کے معاملہ میں یہ انداز بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جس بات کو ہم دینی قرار دیں اس کے متعلق ہمیں یقین ہونا چاہیئے کہ وہ فی الواقعہ دینی ہے۔ آپ کسی مسلمان سے پوچھئے۔ وہ بلا تأمل کہہ دے گا کہ دین نام ہے "قرآن اور حدیث" کا۔ قرآن کے دین ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں۔ خود خدا نے اسے دین کا ضابطہ قرار دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حدیث بھی دین کا جزو ہے؟ یہ تھا وہ سوال جس پر غور کرنے کی دعوت طلوعِ اسلام نے دی۔ طلوعِ اسلام کا کہنا یہ تھا کہ اگر حدیثیں بھی دین کا جزو تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہیئے تھا کہ جس طرح آپؐ نے امت کو قرآن دیا تھا اسی طرح اپنی احادیث کا ایک مستند مجموعہ بھی اُمت کو دے جاتے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ آپؐ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ سوال خالص علمی اور دینی تھا اور اس پر بحث بھی اسی انداز سے ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے مذہب پرست طبقہ میں اتنا ضبط ہی نہیں کہ وہ دین کے مسائل پر جذبات سے الگ ہٹ کر گفتگو کر سکیں۔ اس لئے انہوں نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث اور کافر بنانا شروع کر دیا لیکن طلوعِ اسلام نے اس کے باوجود ان کے اعتراضات کا جواب دیا اور اپنے سوالات کو بار بار دہرایا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء سے اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ اس سلسلہ میں حدیثوں کے متعلق معلومات کا اس قدر ذخیرہ فراہم ہو گیا کہ ہر طرف سے تقاضے موصول ہونے لگے کہ ان تمام مباحث کو یکجا کر دیا جائے تاکہ اس سے عام فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چنانچہ یہ گراں بہا ذخیرہ، چار چار سو صفحات کی دو جلدوں میں سمٹ کر آیا ہے جن میں سے جلد اوّل پیشِ خدمت ہے۔ اور جلد دوم عنقریب سامنے

آجائے گی۔ ہماری درخواست صرف اس قدر ہے کہ آپ ان مباحث کا ٹھنڈے دل سے خالی الذہن ہو کر مطالعہ فرمائیں اور اس کے بعد جس فیصلے پر آپ کی بصیرت آپ کو پہنچائے اسے قبول کرلیں۔ یہ دین کا سوال ہے۔ آپ کا یا ہمارا نجی معاملہ نہیں۔ اس لئے اس سوال کی پوری اہمیت کو سامنے رکھ کر نہایت متانت اور سنجیدگی سے اس پر غور فرمائیے۔ اُمید ہے کہ اس طرح آپ پر حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔

واضح رہے کہ طلوعِ اسلام نہ کسی فرقہ سے متعلق ہے اور نہ ہی (خدانکردہ) کسی نئے مذہب کا داعی۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ دین کو اس کے اصلی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ خدا اسے کامیاب کرے۔

والسلام

۷، دسمبر ۱۹۵۳ء

(طلوعِ اسلام

۲۵ بی، گلبرگ ۲۔ لاہور)

طبع جدید

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مدت ہوئی ختم ہو گیا تھا اور اس کی مانگ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیشِ نظر اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ علاوہ بریں، اس میں اس قدر حک و اضافہ کیا گیا ہے کہ یہ گویا ایک نئی کتاب بن گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ ایڈیشن سابقہ ایڈیشن سے بھی زیادہ مفید پایا جائے گا۔

ہم اس حقیقت کو پھر دہرانا چاہتے ہیں کہ طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے، نہ ہی یہ کسی نئے فرقے کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے۔ نہ ہی یہ منکرِ حدیث ہے اور نہ ہی (معاذ اللہ) منکرِ شانِ رسالتؐ۔ اس کے پیشِ نظر مقصد صرف یہ ہے کہ دین میں جس چیز کو جس مقام پر ہونا چاہیئے اسے اُسی مقام پر رکھا جائے۔ اس کی موجودہ کوشش بھی اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ خدا اسے شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔

اگست سنہ ۱۹۶۵ء

(طلوعِ اسلام
۲۵ بی، گلبرگ ۲۔ لاہور)

تیسرا ایڈیشن

ہماری اس کوشش کو اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت عطا فرمایا۔ اور اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی جلد ختم ہوگیا۔ لیکن اس کے تازہ ایڈیشن کی اشاعت میں ہم نے عمداً کچھ تاخیر کی تاکہ جو نئے گوشے اس دوران میں سامنے آئے ہیں اُن کی وضاحت بھی کردی جائے۔ اس ایڈیشن میں یہ تمام اضافے آگئے ہیں جس کی وجہ سے یہ ایڈیشن، سابقہ ایڈیشنوں کے مقابلہ میں زیادہ افادہ کا موجب ہوگیا ہے۔ جن احباب کی طرف سے اس ایڈیشن کے لئے مسلسل تقاضے موصول ہوتے رہے، اس تاخیر کے لئے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں ہمیں امید ہے کہ اس کے اضافے اس کا ازالہ کردیں گے۔

والسلام

دسمبر ۱۹۷۵ء (طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور)

طبع چہارم

مقامِ حدیث پہلی بار دسمبر ۱۹۵۳ء کو شائع ہوئی۔ اگست ۱۹۶۵ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن آیا تو اس میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ اس تازہ ایڈیشن میں اس قدر حک و اضافہ کیا گیا ہے کہ گویا یہ نئی کتاب بن گئی ہے۔ تیسرا ایڈیشن دسمبر ۱۹۷۵ء کو مزید اضافہ جات کے ساتھ شائع کیا گیا۔ ۱۹۷۵ء سے لے کر ۲۰۰۱ء تک یہی ایڈیشن متواتر چھپتا چلا آرہا ہے۔ گذشتہ ربع صدی کے دوران کتب کی ہیئت و ترتیب اور صفحات کے نمبر بالکل بدل چکے ہیں جن کے جا بجا حوالے مقامِ حدیث میں آتے ہیں۔ قارئین کی طرف سے حوالہ جات تلاش کرنے میں دقت پیش آنے کی شکایات مسلسل موصول ہو رہی تھیں۔ ان شکایات کے پیشِ نظر، زیرِ نظر ایڈیشن میں پرانے حوالہ جات کے ساتھ ساتھ نئے حوالے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ قارئین کو مارکیٹ میں دستیاب کتب میں سے انہیں تلاش کرنے میں سہولت رہے۔ اُمید ہے کہ طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی یہ کاوش مفید ثابت ہوگی۔

والسّلام

مئی ۲۰۰۱ء

پروفیسر ڈاکٹر زاہدہ درانی

ایگزیکٹو ہیڈ طلوعِ اسلام ٹرسٹ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حدیث کی صحیح پوزیشن

معاشرتی امور میں بالعموم، اور مذہب کی دنیا میں بالخصوص، بعض باتیں اس طرح مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں کہ ان کے متعلق کسی قسم کے غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی حالانکہ ان کے مسلّمہ ہونے کی دلیل اور سند اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ وہ باتیں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلی آتی ہیں۔ ان پر غور و فکر نہ کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ ذہنِ انسانی عام طور پر بڑا اسہل انگار واقعہ ہوا ہے، غور و فکر کے لئے اسے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اور یہ محنت سے جی چراتا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑی وجہ یہ ہے کہ جب کسی مسلّمہ کے گرد مذہبی تقدّس کا ہالہ قائم کر دیا جائے تو اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے انسان ڈرتا ہے، کانپتا ہے، تھرتھراتا ہے۔ وہ اسے سنگین جرم اور شدید گناہ سمجھتا ہے کہ اس پر غور و فکر کر کے کسی نتیجہ پر پہنچا جائے۔ اگر اسے غور و فکر کی اہمیت بھی بتائی جائے تو اس کے غور و فکر کی حد اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ اگر اسے کوئی ایسی دلیل مل جائے جو اس مسلّمہ کی تائید کرتی ہو تو وہ اسے قابلِ قبول قرار دے کر بطور سند پیش کر دیتا ہے۔ لیکن جو دلیل یا سند اس کے خلاف جائے اسے جھٹ سے رد کر دیتا ہے۔ پھر اُسے اپنے داخلی اضطراب و تذبذب سے کہیں زیادہ خطرہ مذہب پرست طبقہ کی خارجی مخالفت سے ہوتا ہے۔ ان کی طرف سے طعن و تشنیع اور تفسیق و تکفیر اُسے چھلاوا بن کر ڈراتی ہے جس سے خائف ہو کر وہ غور و فکر اور تنقید و تحقیق کے "شجرِ ممنوعہ" کے قریب تک جانے کی جرأت نہیں کرتا۔

تحقیق کی ضرورت

لیکن اگر آپ کو اس سے اتفاق ہے کہ حقیقت وہی ہے جس تک تحقیق و تفتیش کے بعد پہنچا جائے اور ایمان وہی ایمان جسے علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رُو سے اختیار کیا جائے تو پھر کسی مسلّمہ کو بھی بلا تحقیق و تنقید تسلیم نہیں کرنا چاہیئے خواہ وہ کتنے ہی زمانے سے متوارث کیوں

نہ چلا آرہا ہو۔ اس ضمن میں نہ اپنی داخلی کشمکش سے گھبرانا چاہیئے اور نہ ہی خارجی مخالفت سے خوف کھانا چاہیئے۔ اسی سلسلہ میں ہم اس وقت ایک ایسے مسئلہ کو سامنے لانا چاہتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ ایک عام عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ (غیر شعوری طور پر) یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ آپ کسی مسلمان سے پوچھئے کہ دین کس چیز کا نام ہے وہ بلا تأمل کہہ دے گا کہ دین، قرآن و حدیث کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ بات ہمارے دلوں میں اس قدر راسخ ہو چکی ہے کہ کبھی تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ اس کے متعلق کسی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس بات کو آپ اس قدر راسخ عقیدہ کے طور پر مانتے اور حتم و یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں، کیا آپ نے اسے تحقیق و تدقیق کے بعد مانا اور علم و بصیرت کی بنا پر تسلیم کیا ہے یا اسے محض اس لئے اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دے رکھی ہے کہ وہ ہم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلی آرہی ہے۔ آیئے! ہم اس پر ذرا غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ اس طرح ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ اس سے دوہرا فائدہ ہوگا۔ اگر تحقیق و تدبر نے ہمیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ یہ مسئلہ واقعی حقیقت پر مبنی ہے، تو پھر ہمارا یہ عقیدہ مبنی علیٰ بصیرت ہو جائے گا' اور اس سے ہمیں جس قدر صحیح اطمینان حاصل ہوگا وہ ظاہر ہے لیکن اگر ہم علم و تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ مسئلہ مبنی علی الحقیقت نہیں تو پھر ہم ایک ایسے عقیدے کو چھوڑ سکیں گے جسے ہم محض رسماً اختیار کئے چلے آرہے ہیں۔ ایسا کرنے میں آپ قرآنِ کریم کے ایک تاکیدی حکم کی تعمیل کریں گے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت، بصارت اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت، سب سے اس کے متعلق سوال ہوگا۔

اور وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور) آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جائیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر جاتے (بلکہ عقل و فکر سے کام لے کر انہیں قبول اور اختیار کرتے ہیں)۔

دین دین کے متعلق ایک چیز سے تو یقیناً آپ متفق ہوں گے، یعنی یہ کہ دین وہی ہو سکتا ہے جو یقینی ہو، ظنی اور قیاسی نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (۱۰/۳۶)

اور ان میں سے اکثر لوگ ظن کے سوائے کسی اور چیز کا اتباع نہیں کرتے۔ یقیناً ظن حق کے مقابلہ میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ اللہ خوب واقف ہے کہ یہ کیا کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جن دو اجزاء (قرآن اور حدیث) کے مجموعے کا نام دین سمجھا جاتا ہے، ان میں سے کوئی ظنی تو نہیں؟ اور کیا یہ دونوں اجزاء اللہ اور اس کے رسولؐ نے دین کی حیثیت سے مسلمانوں کو دیئے ہیں؟

پہلے قرآنِ کریم کو لیجئے۔ قرآن میں ایک مرتبہ نہیں سینکڑوں مرتبہ اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ یہ کتاب حق ہے۔

وَالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ .... (۳۵/۳۱)

جو کچھ ہم نے کتاب سے تیری طرف وحی کیا ہے وہ (بالکل) حق ہے ....!

اس کتابِ عظیم کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ اس کتاب میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، یہ سراسر حق ہے، یقینی ہے، ظنی اور قیاسی نہیں، ریب و شکوک کی حدود سے بالاتر ہے۔ یہ تو ہے نفسِ کتاب کے متعلق۔ اب یہ کہ یہ یقینی شے مسلمانوں کو ملی کیسے اور ان کے پاس رہے گی کس حیثیت سے۔ سو ظاہر ہے کہ قرآن کریم حضورؐ پر نازل ہوا۔ اور اس کے متعلق جمع و تدوین کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (۷۵/۱۷)

یقیناً اس (کتاب) کا جمع کرانا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

اور صرف جمع و تدوین ہی نہیں بلکہ اس بات کی ذمہ داری بھی کہ قیامت تک اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل اور کسی نوعیت کی تحریف و الحاق نہ ہو سکے۔ فرمایا!

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس حفاظت کو عملی شکل دینے کے لئے جناب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا کہ

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ... (۵/۶۷)

اے رسول جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو۔

قرآن حضورؐ نے اس حکمِ خداوندی کی تعمیل میں جو کچھ کیا وہ آپ کے سامنے ہے۔ یعنی صحابہ کبارؓ کی جماعت کو قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ لکھا دیا جاتا تھا۔ ہزاروں حفاظ تھے جنہیں لفظاً لفظاً یاد کرایا جاتا تھا۔ پھر حضورؐ ان کا یاد کردہ خود سنتے تھے اور ان کی تصحیح و تصویب فرماتے تھے۔ چنانچہ دنیا سے تشریف لے جانے سے پیشتر حضورؐ نے پورا پورا اطمینان کر لیا کہ پیغامِ خداوندی جو اُن پر نازل ہوا تھا' وہ اپنی کامل و مکمل شکل میں لوگوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ لکھا ہوا بھی محفوظ ہے اور ہزاروں حفاظ کے سینوں میں بھی مصئون۔ حجۃ الوداع کے عدیم النظیر خطبہ میں حضورؐ نے لاکھوں مسلمانوں کے مجمع سے اس امر کا اقرار لیا کہ آپؐ نے اس پیغامِ الٰہی کو اُن تک پہنچا دیا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالےٰ کو اس پر گواہ قرار دیا کہ تُو شاہد ہے کہ میں نے اپنا فریضۂ رسالت ادا کر دیا ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) نے حفاظتِ قرآنِ کریم کو سب سے بڑا فریضہ سمجھا اور اس کے لئے عملی ذرائع اختیار کئے۔ چنانچہ یہ صحیفۂ ربانی آج تک حفاظ کے سینوں میں اور صفحاتِ قرطاس پر اس انداز سے محفوظ چلا آ رہا ہے کہ اپنے تو اپنے' غیروں تک کو اعتراف ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو قرآنِ کریم موجود ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبیِ اکرمؐ نے انہیں دیا تھا۔ اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے اس لئے اس کا یہ آخری پیغام قیامت تک اسی طرح محفوظ رہے گا۔ یہ ہے یقینی چیز جس کے دین ہونے میں ظن و قیاس کی کوئی گنجائش نہیں۔

اب اس حصہ کو لیجئے جسے عام طور پر دین کا دوسرا جزو قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی مجموعۂ احادیث۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ بھی اسی طرح یقینی ہے جس طرح قرآنِ کریم ہے۔

حدیث سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے علاوہ اور کسی چیز کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہ تو احادیث کو جمع کیا' نہ اُن کے جمع کرنے کا حکم دیا اور نہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا۔

خدا کے بعد خدا کے رسولؐ کا اس باب میں کیا طرزِ عمل رہا؟ یہ چیز بھی بڑی غور طلب ہے' اس لئے کہ احادیث' نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر یہ جزوِ دین تھیں تو جس طرح

آپؐ نے قرآنِ کریم کے ایک ایک لفظ کو لکھوایا، زبانی یاد کرایا، لوگوں سے سُنا، دہرایا، اور ہر طرح سے اطمینان فرما لیا کہ اس کا ایک ایک حرف محفوظ کر دیا گیا ہے۔ احادیث کے متعلق بھی یہی انتظام فرمانا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ منصبِ رسالت کا یہی تقاضا تھا۔ اور بہ حیثیتِ رسول، حضورؐ کا یہ فریضہ کہ دین کو محفوظ ترین شکل میں امت کے پاس چھوڑتے۔ لیکن حضورؐ نے جہاں قرآنِ کریم کے متعلق اس قدر حزم و احتیاط سے کام لیا، احادیث کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا۔ برعکس اس کے خود کتبِ احادیث میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

لا تکتبوا عنی غیر القراٰن و من کتب عنی غیر القراٰن فلیمحہ۔ (جامع ترمذی اُردو جلد دوم صفحہ ۱۴۱ مطبوعہ دارالاشاعت اُردو بازار کراچی)

مجھ سے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز لکھی ہو اُسے مٹا دے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ حکم عارضی تھا۔ اس لئے کہ بعض روایات سے یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی درخواست پر انہیں اجازت فرما دی تھی کہ وہ چاہیں تو احادیث لکھ لیا کریں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ سے زیادہ اتنا ثابت ہو گا کہ حضورؐ نے اجازت عطا فرمائی تھی، اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا تھا۔ پھر اجازت کے بعد یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کبھی کسی سے دریافت فرمایا ہو کہ اس نے کون کون سی حدیثیں لکھی ہیں اور اس سے وہ احادیث سنی ہوں، اور ان کی تصحیح یا تصویب فرمائی ہو۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس زمانے میں عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا اس لئے ان کی یادداشت پر بھروسہ کر لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر دین کے معاملہ میں یادداشت پر بھروسہ کر لینا ہی کافی تھا تو قرآنِ کریم کے لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لئے لوگوں کی یادداشت کیوں نہ کافی سمجھی گئی! یہ بھی یاد رہے کہ قرآنِ کریم کا لفظ لفظ یاد کرایا جاتا تھا اور پھر اُن سے سُن لیا جاتا تھا اور اس کی تصدیق فرمائی جاتی تھی۔ اگر کسی نے کچھ احادیث اپنے طور پر یاد بھی کر لی ہوں تو اُمت کے لئے وہ سند نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان احادیث کو سُن کر ان کے مستند ہونے کی تصدیق نہ فرما دیتے، اور انہیں ایک کتاب میں محفوظ کر کے امت کو نہ دے جاتے اور پھر وہی احادیث قرآنِ کریم کی طرح اپنے اصلی الفاظ میں آگے نہ چلتیں لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں نہیں ہوئی۔ آپ خیال فرمایئے کہ اگر احادیث بھی دین کا جزو ہوتیں تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حفاظت کا کچھ بھی انتظام نہ فرماتے۔

روایات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرآنِ کریم کے علاوہ کچھ اور متفرق چیزیں بھی حضورؐ کے ارشاد کے

مطابق قلم بند ہوئی تھیں. مثلاً وہ تحریری معاہدات، احکام اور فرامین وغیرہ جو آنحضرتؐ نے قبائل یا اپنے عمال کے نام بھیجے. لیکن اس باب میں جو کچھ آج تک معلوم ہو سکا ہے وہ فقط اتنا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ حضورؐ کی وفات کے وقت صرف حسبِ ذیل تحریری سرمایہ موجود تھا.

(۱) پندرہ سو صحابہؓ کے نام (ایک رجسٹر میں).

(۲) مکتوباتِ گرامی جو حضورؐ نے سلاطین و امراء کو لکھے.

(۳) چند تحریری احکام، فرامین اور معاہدات وغیرہ.

(۴) کچھ حدیثیں جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ نے اپنے طور پر قلم بند کیں.

اِن احادیث کے متعلق نہ تو کہیں سے یہ ثابت ہے کہ حضورؐ نے اُن کی تصدیق فرمائی تھی اور نہ ہی وہ بعد میں اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود رہیں. لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو کچھ امت کو دیا تھا، وہ صرف قرآن تھا. احادیث کا کوئی مجموعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے امت کو نہیں دیا. خود بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرمؐ نے (اُمت کے لئے) کیا چھوڑا ہے، تو آپ نے کہا کہ مَا تَرَكَ اِلَّا مَا بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ. یعنی حضورؐ نے قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ نہیں چھوڑا. (صحیح بخاری، جلد سوم، کتاب فضائل القرآن، ص ۴۴)

باب مَنْ قَالَ لَمْ یَتْرُكِ النَّبِیُّ اِلَّا مَا بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ. باب ۷، حدیث ۱۱، صحیح بخاری (مترجم) شائع کردہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور.

صحابہؓ کا عمل

حضور نبیِ اکرمؐ کے بعد صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفائے راشدینؓ کا عمل ہمارے سامنے آتا ہے. مسند امام احمد میں لکھا ہے کہ صحابہؓ نے فرمایا[1]

> ہم لوگ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے. تب ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لکھ لیا کرتے ہو. ہم نے عرض کیا کہ حضورؐ سے جو کچھ ہم سنتے ہیں (اس کو لکھ لیا کرتے ہیں) تب آپؐ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب؟ (یعنی ایسا نہیں کرنا چاہیئے). پھر فرمایا (ستھری کرو. خالص رکھو) اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ سے اسے پاک رکھو (صحابیؓ

---

[1] ہم نے ذیل کی روایات کو مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کی کتاب "تدوینِ حدیث" سے اقتباس کر کے لکھا ہے تاکہ ان کی صحت کے متعلق کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے.

کہتے ہیں) کہ تب ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس کو ایک میدان میں اکٹھا کیا۔ پھر اس کو ہم نے جلا دیا۔

(تدوینِ حدیث از مناظر احسن گیلانی، ص ۲۴۹، مطبوعہ کراچی)

امام ذہبی نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے متعلق حسبِ ذیل روایت بھی لکھی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔ پس چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو۔ پھر اگر تم سے کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ پس چاہیئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے ان کو حلال قرار دو۔ اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا، ان کو حرام ٹھہراؤ۔

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی بحوالہ تدوینِ حدیث ص ۳۲۱)

امام ذہبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میرے والد (حضرت ابو بکرؓ) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جمع کیا اور ان کی تعداد پانچ سو تھی۔ پھر ایک شب میں دیکھا گیا کہ وہ (یعنی حضرت صدیقِ اکبرؓ) بہت زیادہ کروٹیں بدل رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ یہ کروٹیں کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے بدل رہے ہیں یا کوئی خبر آپ تک پہنچی ہے (جسے سُن کر آپ بے چین ہو رہے ہیں)۔ آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا)

جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ بیٹی! ان حدیثوں کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں۔ پھر آگ منگائی اور اس نسخہ کو جلا دیا۔　　(ایضاً تدوینِ حدیث، ص ۲۸۸-۲۸۵)

جہاں تک حضرت عمرؓ کا تعلق ہے، علامہ ابن عبد البر نے اپنی مشہور کتاب جامع بیان العلم میں اس روایت کو نقل کیا ہے:

حضرت عمرؓ بن خطاب نے چاہا کہ سنن یعنی حدیثوں کو لکھوا لیا جائے تب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوںؓ سے فتویٰ طلب کیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ حدیثیں لکھوالی جائیں۔

لیکن لوگوں کے اس مشورہ سے حضرت عمرؓ کا قلب مطمئن نہ ہوا۔ چنانچہ کامل ایک ماہ تک حضرت عمرؓ اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ پھر ایک دن جب صبح ہوئی اور اس وقت حق تعالیٰ نے فیصلہ میں یکسوئی کی کیفیت ان کے

قلب میں عطا کر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں نے حدیثوں کو قلم بند کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر مجھے ان قوموں کا خیال آیا جو تم سے پہلے گزری ہیں کہ انہوں نے کتابیں لکھیں اور ان پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں اور قسم ہے اللہ کی کہ میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط کرنا نہیں چاہتا۔ (ایضاً تدوین حدیث ص ۳۹۴)

اور یہ اس لئے تھا کہ جیسا کہ (پہلے لکھا جا چکا ہے) خود نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو جس نے قرآن کے سوا کوئی میری بات لکھی ہے تو چاہیئے کہ اسے مٹا دے۔

یہی نہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کر دیا کہ حدیث کو جمع اور مدوّن نہیں کرنا چاہیئے بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھے۔ چنانچہ طبقات میں ہے کہ:-

> حضرت عمرؓ کے زمانے میں حدیثوں کی کثرت ہوگئی تو آپ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے پاس پیش کریں۔ حسب الحکم لوگوں نے اپنے مجموعے حضرت عمرؓ کے پاس پیش کر دیئے۔ تب آپ نے انہیں جلانے کا حکم دیا۔
>
> طبقات ابنِ سعد، جلد ۵، ص ۱۴۱ (تدوینِ حدیث ص ۳۹۹)

یعنی حدیثوں کے نذرِ آتش کرنے کا یہ تیسرا واقعہ ہے۔ پہلی دفعہ صحابہؓ نے نبیٔ اکرمؐ نے ارشاد کے مطابق حضورؐ کے سامنے انہیں جلایا۔ پھر حضرت ابو بکرؓ نے اپنے مجموعے کے ساتھ یہی کچھ کیا اور تیسری دفعہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر، ان کے مجموعوں کو اپنے سامنے نذرِ آتش کر دیا۔

یہ کچھ دارالخلافہ میں ہوا۔ اس کے بعد کیا ہوا، اس کے متعلق حافظ ابنِ عبدالبر نے جامع بیان العلم میں یہ روایت نقل کی ہے۔

> حضرت عمرؓ ابنِ خطاب نے پہلے تو یہ چاہا کہ حدیثوں کو قلم بند کر لیا جائے۔ مگر پھر ان پر واضح ہوا کہ قلم بند کرانا ان کا مناسب نہ ہوگا۔ تب الامصار (یعنی چھاؤنیوں اور دیگر اضلاعی شہروں) میں یہ لکھ کر بھیجا کہ جس کے پاس حدیثوں کے سلسلہ کی کوئی چیز ہو، چاہیئے کہ اسے محو کر دے۔ یعنی ضائع کر دے۔
>
> (جامع بیان العلم، جلد ۱، ص ۶۵) (تدوینِ حدیث ص ۴۰۰)

مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے اپنی کتاب میں ایک خاص باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے "قرنِ اوّل میں حکومت کی طرف سے حفاظت و اشاعتِ حدیث کا اہتمام نہ ہونا کوئی امر اتفاقی نہیں، بلکہ مبنی بر مصلحت ہے" انہوں نے اس سے پہلے امام ابن حزم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:-

جس وقت حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی تو مصر سے لے کر عراق تک اور عراق سے لے کر شام تک، اور شام سے یمن تک قرآن کے جو نسخے پھیلے ہوئے تھے ان کی تعداد اگر ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔ (تدوینِ حدیث، ص ۲۱۶)

اس کے بعد انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ جب قرآن کریم کی اشاعت میں اس قدر اہتمام کیا گیا تو اگر حکومت چاہتی تو احادیث کی اشاعت میں کون سا امر مانع ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ حکومت نے دیدہ دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ ہے کیفیت صحابہؓ کبارؓ کے زمانے میں احادیث مرتب کرنے کی یعنی۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حکم دیا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو۔

(۲) صحابہؓ نے جو احادیث اپنے طور لکھی تھیں، انہیں انہوں نے حضورؐ کے فرمان کے مطابق جلا دیا۔

(۳) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مدوّن کردہ مجموعۂ احادیث کو جلا دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ احادیث بیان نہ کریں۔

(۴) حضرت عمرؓ نے ایک ماہ تک غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ احادیث جمع اور مدوّن نہیں کرنی چاہئیں۔

(۵) حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر ان سے احادیث کے مجموعے منگوائے اور انہیں جلا دیا۔

(۶) اور باقی شہروں میں حکم بھیج دیا کہ اگر کسی کے پاس احادیث لکھی ہوئی ہوں تو وہ انہیں ضائع کر دے۔

اور

(۷) یہ کچھ اتفاقاً نہیں کیا گیا۔ بلکہ مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کے الفاظ میں ایسا دیدہ دانستہ کیا گیا۔

مزید شدّت

حضرت عمرؓ نے اس باب میں اور بھی شدّت سے کام لیا۔ آپ لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے سختی سے روکتے تھے۔ قرعہ بن کعبؓ راوی ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے ہم لوگوں کو عراق بھیجا تو ہمیں تاکید کر دی کہ یاد رکھو کہ تم ایسے مقام پر جا رہے ہو جہاں کے لوگوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں۔ تم ان کو احادیث میں اُلجھا کر قرآن سے غافل نہ کر دینا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسی طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے دُرّے سے پیٹتے۔

یہ بھی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ابو دردا اور ابو مسعودؓ انصاری کو کثرت

روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا۔ (ان تمام روایات کے لئے دیکھئے تذکرۃ الحفاظ) ممکن ہے ان روایات کی صحت کو محلِ نظر قرار دے دیا جائے، حالانکہ ہمارے نزدیک ان کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ منشائے قرآنی اور عملِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق ہیں۔ بایں ہمہ ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے، نہ ہی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اگر ہمیں یہ داخلی شہادات نہ بھی ملتیں تو بھی ایک حقیقت ایسی ہے جس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں اور وہ یہ کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بھی کوئی ایسا مجموعۂ احادیث نہیں ملتا جو ان حضرات نے خود مرتب فرمایا ہو یا اُن کی زیرِ نگرانی مدوّن کیا گیا ہو۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر یہ حضرات (رضی اللہ عنہم) احادیث کو دین کا جزو سمجھتے تو جس طرح انہوں نے قرآن کریم کی عام نشر و اشاعت کا اہتمام فرما دیا تھا، خلافت کی زیرِ نگرانی احادیث کا بھی کوئی مجموعہ مرتب کر کے ضرور شائع کر دیتے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، خلافتِ راشدہ میں بھی جمع و تدوینِ حدیث کے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔

صحیفۂ ہمام ابنِ منبہ

علمائے حدیث کو بڑی تحقیق و کاوش کے بعد پہلی صدی ہجری کا ایک مجموعۂ احادیث ملا ہے جو صحیفۂ ہمام ابنِ منبہ کے نام سے متعارف ہے (اس صحیفہ کو چند سال اُدھر، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے حیدر آباد دکن سے شائع کیا تھا) امام ہمام ابنِ منبہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔ اس صحیفے میں کُل ۱۳۸ حدیثیں ہیں جن کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے انہیں اپنے استاد (حضرت ابو ہریرہؓ) کے سامنے لکھا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی تھی۔ لہٰذا اس مجموعہ کے متعلق یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ ۵۸ھ سے پہلے کا مرتب شدہ ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ امام ہمام ابنِ منبہ ۵۸ھ سے پہلے، مدینہ میں بیٹھ کر احادیث کا مجموعہ مرتب کرتے ہیں اور انہیں صرف ۱۳۸ احادیث ملتی ہیں۔ اور تیسری صدی ہجری میں جب امام بخاریؒ احادیث جمع کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو انہیں چھ لاکھ احادیث مل جاتی ہیں۔ (امام احمد بن حنبلؒ کو دس لاکھ اور امام یحییٰ ابنِ معین کو بارہ لاکھ احادیث ملی تھیں) نیز یہ حقیقت بھی غور طلب ہے کہ جو احادیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہیں، ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ لیکن ان کے شاگرد کے مجموعہ میں کل ۱۳۸ احادیث ہیں۔ بہرحال، پہلی صدی ہجری میں انفرادی طور پر احادیث جمع کرنے کی جو کوشش ہوئی اس کا ماحصل صحیفۂ امام ہمام ابنِ منبہ کی ایک سو اڑتیس احادیث ہیں۔ اس کے علاوہ اس دَور کے کسی تحریری سرمایہ کا سراغ

نہیں ملتا۔

امام زہریؒ اس کے بعد ۱۰۰ھ کے قریب خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کچھ احادیث اپنے طور پر جمع کرائیں۔ اُن کے بعد امام ابن شہاب زہریؒ (المتوفی ۱۲۴ھ) نے خلفائے بنی اُمیّہ کے حکم سے ایک مختصر سا مجموعۂ احادیث تیار کیا جس کے متعلق ان کا اپنا قول ہے کہ مجھے یہ کام ناگوار گزرا۔[1] لیکن نہ تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جمع کردہ احادیث کسی مدوّن صحیفہ کی شکل میں موجود رہیں اور نہ امام زہریؒ کا مذکورہ صدر مجموعہ ہی کہیں موجود ہے۔ البتہ بعد کی کتبِ احادیث میں ان کی روایات ملتی ہیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ شروع ہوا جب لوگوں کو قرنِ اولیٰ کے احوال و کوائف (تاریخ) لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ ان تصانیف کا مسالہ (MATERIAL) وہ روایات (باتیں) تھیں جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور چلی آتی تھیں۔ بعض حضرات نے اس وسیع موضوع کو سمٹایا اور صرف انہی باتوں کو اکٹھا کیا جو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ ان باتوں کے مجموعہ کا نام کتبِ احادیث ہے (احادیث کے معنی ہی باتیں ہیں) احادیث کا پہلا مجموعہ جو اس وقت موجود ہے امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) کی کتاب مؤطا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس زمانے میں مدینہ میں ارکانِ اسلام کے متعلق صحابہؓ کا عمل کیا تھا۔ اس کے مختلف نسخوں میں تین سو سے پانچ سو تک احادیث ملتی ہیں۔ امام مالکؒ کے بعد یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا گیا۔ اور دوسرے ائمہ علوم کو بھی احادیث کے مجموعے مرتّب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس دَور میں کئی ایک کتبِ احادیث مدوّن ہوئیں۔ عہدِ عباسی میں اسلامی علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کتبِ احادیث کی نشر و اشاعت نے بھی نمایاں وسعت حاصل کرلی۔ کتبِ احادیث میں سب سے زیادہ مشہور صحیحین (صحیح بخاری و مسلم ہیں)۔ امام بخاریؒ (المتوفی ۲۵۶ھ) نے قریب چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں اور ان میں سے کانٹ چھانٹ کر جو مجموعہ تیار کیا اس میں مکرّرات حذف کردینے کے بعد دو ہزار چھ سو تیس احادیث ہیں۔ اسی کتاب کو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ (یعنی قرآن کے بعد دنیا میں صحیح ترین کتاب) کہا جاتا ہے۔ کتبِ احادیث کے اسی قسم کے مجموعے ہیں جنہیں اب دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے چھ مجموعے ایسے ہیں جنہیں اہلِ سنت و الجماعت (سُنّی حضرات) صحیح ترین مانتے ہیں (انہیں صحاح ستہ۔ یعنی حدیث کی چھ صحیح ترین کتابیں کہا جاتا ہے) واضح رہے کہ شیعہ حضرات کے احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔[2] وہ سنّیوں کے

---

[1] مختصر جامع بیان العلم۔ مطبوعہ قاہرہ۔ مصنف حافظ ابن عبدالبر۔

[2] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

مجموعوں کو صحیح نہیں مانتے۔ نہ ہی سُنّی ان کے مجموعوں کو قابلِ سند مانتے ہیں۔

صحاحِ ستّہ یہ ہیں:۔

۱۔ صحیح بخاری۔
۲۔ صحیح مسلم
۳۔ جامع ترمذی۔
۴۔ سنن ابوداؤد
۵۔ سنن ابنِ ماجہ
۶۔ سنن نسائی۔

ان میں سے بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ اوران دونوں میں سے بخاری کو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ۔ ان مجموعوں کے جامعین کے مختصر تعارف حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ امام بخاریؒ

یہ بخارا میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ (یا بعض کے نزدیک ۲۶۰ھ) میں سمرقند کے قریب فوت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھر کر چھ لاکھ کے قریب احادیث جمع کیں۔ ان میں سے انہوں نے اپنے معیار کے مطابق صرف قریب (۷۳۰۰) احادیث کو صحیح پایا اور انہیں اپنی کتاب میں درج کرلیا۔ (باقی قریب پانچ لاکھ ترانوے ہزار کو مسترد کردیا)۔ ان (۷۳۰۰) میں سے بہت سی احادیث مختلف ابواب میں مکرّر نقل ہوئی ہیں۔ اگر ان مکرّرات

(سابقہ صفحہ کا فٹ نوٹ) شیعہ حضرات کے احادیث کے مجموعے حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) الکافی:۔ جامع ابوجعفر محمد جو کلینی کے نام سے مشہور ہیں ان کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی۔

(۲) من لایستحضرہ الفقیہ:۔ یہ شیخ محمد ابن علی (متوفی ۳۸۱ھ) کی تالیف ہے۔

(۳) تہذیب:۔ مؤلفہ شیخ ابوجعفر محمد بن حسن۔ متوفی ۴۶۰ھ۔

(۴) استبصار:۔ یہ بھی انہی کی تالیف ہے۔

ان میں سے بھی کوئی عرب نہیں۔

کو شمار نہ کیا جائے تو باقی ۲۷۶۲ رہ جاتی ہیں یا ۲۶۳۰۔

۲۔ امام مسلمؒ

صحیح مسلم کے جامع امام مسلمؒ بن حجاج تھے جو ایران کے مشہور شہر نیشاپور کے باشندے تھے۔ ان کی ولادت ۲۰۴ھ میں اور وفات ۲۶۱ھ میں ہوئی۔

۳۔ امام ترمذیؒ

امام ابو عیسیٰ محمد ترمذی۔ یہ ایران کے شہر ترمذ کے رہنے والے تھے۔ سالِ ولادت ۲۰۹ھ اور وفات ۲۷۹ھ ہے۔

۴۔ امام ابوداؤدؒ

سیستان (ایران) کے رہنے والے تھے۔ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۵ھ میں وفات پا گئے۔

۵۔ امام ابن ماجہؒ

ابو عبداللہ محمد بن زید ابنِ ماجہ۔ یہ شمالی ایران کے شہر قزوین کے رہنے والے تھے۔ سن پیدائش ۲۰۹ھ اور رحلت کا سن ۲۷۳ھ ہے۔

۶۔ امام عبدالرحمٰنؒ نسائی

یہ مشرقی ایران کے صوبہ خراسان کے ایک گاؤں نسا میں پیدا ہوئے۔ ان کا سنِ وفات ۳۰۳ھ ہے۔

ان ائمہ حدیث کے اس مختصر سے تعارف سے حسبِ ذیل امور سامنے آتے ہیں:۔

(۱) یہ سب کے سب ایرانی تھے۔ ان میں عرب کا رہنے والا کوئی نہیں تھا۔ مقامِ حیرت ہے کہ عربوں میں سے کسی نے بھی اس عظیم کام کا بیڑہ نہ اٹھایا۔ اور احادیث کی جمع و تدوین کا کام غیر عربوں (عجمیوں) کے ہاتھوں سرانجام پایا۔

(۲) یہ تمام حضرات تیسری صدی ہجری میں ہوئے۔

(۳) انہوں نے لاکھوں حدیثیں پائیں لیکن ان میں سے بہت تھوڑی ایسی تھیں جنہیں انہوں نے صحیح قرار دے کر اپنے مجموعوں میں درج کیا۔

(۴) یہ تمام احادیث، لوگوں نے انہیں زبانی سنائیں۔ ان کا کوئی تحریری ریکارڈ اس سے پہلے کا موجود نہیں تھا۔

(۵) ان حضرات نے لاکھوں حدیثوں میں سے جن کا انتخاب کیا، وہ انتخاب ان کی ذاتی بصیرت اور فیصلہ کا نتیجہ تھا۔ ان احادیث کے صحیح ہونے کے متعلق نہ تو ان کے پاس خدا کی سند تھی (یعنی خدا نے انہیں بذریعہ وحی نہیں بتایا تھا کہ فلاں حدیث صحیح ہے، اسے رکھ لو، اور فلاں غلط ہے، اسے مسترد کر دو) نہ ہی اس کی کوئی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی (کہ تم نے جن احادیث کا انتخاب کیا ہے وہ فی الحقیقت میرے اقوال ہیں)۔ نہ ہی ان کے پاس پہلے کا کوئی تحریری ریکارڈ تھا جس سے انہوں نے ان احادیث کا انتخاب کر لیا ہو۔ لوگوں کی زبانی باتیں تھیں جنہیں انہوں نے اپنی فراست کے مطابق، صحیح تصور کر کے اپنے مجموعوں میں داخل کر لیا تھا۔

اب آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کی انفرادی کوششوں کے نتیجے کے متعلق کسی طرح بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ یقینی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں؟ پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ اس دو اڑھائی سو سال کے عرصہ میں، جو باتیں لوگوں کی زبانی آگے منتقل ہوتی چلی آ رہی تھیں، ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تھے جو اُسی طرح باپ سے بیٹے یا استاد سے شاگرد نے سُن کر حفظ کر لیے تھے ان باتوں کو ہر راوی اپنے الفاظ میں بیان کرتا تھا۔ (اس نکتہ کی مزید تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے)۔

کتنی حدیثوں کو رد کر دیا

ضمناً، یہ بھی دیکھئے کہ ان حضرات کو کس قدر احادیث ملیں اور ان میں سے انہوں نے کتنی احادیث کو منتخب کر کے اپنے مجموعہ میں داخل کیا۔

(۱) امام بخاری۔ چھ لاکھ میں سے مکررات نکال کر صرف ۲۷۶۲ یا ۲۶۳۰

(۲) امام مسلم۔ تین لاکھ میں سے صرف ۴۳۴۸

(۳) امام ترمذی۔ تین لاکھ میں سے صرف ۳۱۱۵

(۴) امام ابوداؤد۔ پانچ لاکھ میں سے صرف ۴۸۰۰

(۵) امام ابنِ ماجہ. چار لاکھ میں سے صرف ۴۰۰۰
(۶) امام نسائیؒ دو لاکھ میں سے صرف ۴۳۲۱

ظاہر ہے کہ جب ردّ و قبول کا مدار جامع احادیث کی ذاتی بصیرت ہو، تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان لاکھوں کے انبار میں جنہیں ان حضرات نے مسترد قرار دے دیا تھا، کتنی صحیح حدیثیں بھی ضائع ہو گئی ہوں گی. باقی رہا یہ کہ جن احادیث کا ان حضرات نے انتخاب کیا، ان میں کتنی حدیثیں آ گئی ہیں جنہیں کسی صورت میں بھی حضور نبیٔ اکرمؐ کے اقوال یا افعال نہیں قرار دیا جا سکتا" اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی.

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ جمعِ احادیث کی یہ سب کوششیں ان حضرات کی انفرادی تھیں جنہیں خدا اور رسولؐ کی سند حاصل نہیں تھی. اس حقیقت کے پیشِ نظر آپ خیال فرمایئے کہ کیا دین بھی ایسی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یوں لوگوں کی انفرادی کوششوں کے حوالے کر دیتے. یہ تو محض اتفاق ہے کہ امام بخاریؒ اور دیگر حضرات نے اُن باتوں کو یک جا جمع کر دیا جو اُس زمانہ میں عام طور پر مشہور تھیں ورنہ جس طرح ان سے پہلے اس قسم کی کوئی کتابیں مرتب نہیں ہوئی تھیں، اگر یہ حضرات بھی اس کی کوشش نہ کرتے تو" دین کا آدھا حصہ" (معاذ اللہ) بالکل کھو چکا تھا[1]. آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ وہ خدا جو دین کے مکمل ہونے کا اعلان قرآن کریم میں بالتصریح فرما دے اور وہ رسولِ گرامیؐ جن کے بعد قیامت تک کسی اور رسول کو نہ آنا ہو، وہ دین کے ایک ایسے اہم حصہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے؟ ایسا تصور میں بھی نہیں آ سکتا.

روایات بالمعنیٰ

ایک دوسری صورت بھی تھی جس طرح قرآن کریم محفوظ کیا گیا تھا. اگر لوگ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے الفاظ یاد کر لیتے اور وہی الفاظ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے تاآنکہ وہ کتابی شکل میں لکھ لئے جاتے تو بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ کتبِ احادیث کا مجموعہ ایک حد تک یقینی ہے. لیکن یہ بات بھی نہیں تھی. احادیث کی جس قدر کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں. (بخاری اور مسلم سمیت) ان کے الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہیں. یہ احادیث روایات بالمعنیٰ ہیں. یعنی ان کا انداز یہ ہے کہ مثلاً ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سُنا. اس نے اس سے جو کچھ سمجھا،

---

[1] "آدھا حصہ" ہی نہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دین کا ۹/۱۰ حصہ احادیث میں ہے اور صرف ۱/۱۰ حصہ قرآن میں.

اپنے الفاظ میں کسی دوسرے سے بیان کیا۔ اس نے جو کچھ اخذ کیا اسے آگے منتقل کیا۔ اب ذرا تصور میں لائیے اس صورتِ حالات کو کہ یہ سلسلہ ایک دو دن نہیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال نہیں بلکہ دو ڈھائی سو سال تک یونہی جاری رہا اور اس کے بعد لوگوں میں اس طرح پھیلی ہوئی باتوں کو یکجا جمع کیا گیا تو ان باتوں کو پہلے کہنے والے (یعنی نبیؐ اکرمؐ) کے بیان فرمودہ سے جس قدر تعلق ہوگا وہ ظاہر ہے۔ آپ ایک کمرے میں دس آدمیوں کو بٹھا کر ایک کے کان میں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کیجئے، اس کے بعد یہ بات کانوں کان منتقل ہوتی ہوتی جب پھر آپ تک پہنچے تو آپ دیکھیں گے کہ جو کچھ آپ نے کہا تھا اس میں، اور جو کچھ آپ دسویں آدمی سے سُن رہے ہیں، اس میں کس قدر فرق ہوتا ہے، اور جب یہ سلسلہ اڑھائی سو سال تک جاری رہے اور کروڑوں نہیں تو کم از کم لاکھوں آدمیوں کے ذریعے یہ باتیں آگے منتقل ہوئی ہوں، تو ان میں جو اصلیت باقی رہ جائے گی وہ ظاہر ہے۔

مفہوم سمجھنے میں غلطی

اس ضمن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تنقید قابلِ غور ہے۔ جہاں تک نبیؐ اکرمؐ کے ارشاداتِ گرامی کے صحیح مفہوم سمجھنے کا تعلق ہے وہ (بعد کے راوی تو ایک طرف) حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق (بخاری کی ایک حدیث پر تنقید کرتے ہوئے) لکھتے ہیں:-

> ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبیؐ کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابوہریرہؓ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ پوری بات نہیں سُن سکے......... اس قسم کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں جن میں بعض کو بعض روایات نے صاف کر دیا ہے اور بعض صاف ہونے سے رہ گئیں۔ زبانی روایات میں ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔
>
> (روزنامہ تسنیم لاہور، احادیث نمبر، مورخہ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۹ء)

یہ تو رہا حدیث کے سب سے پہلے راوی کی مفہوم فہمی کے متعلق۔ جہاں تک مفہوم کو آگے منتقل کرنے کا تعلق ہے وہ اپنی کتاب تفہیمات حصہ اوّل میں لکھتے ہیں۔

> مثال کے طور پر میں آج ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھ لیجئے کہ مقرر نے کیا کہا۔ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا کوئی کسی کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بہ لفظ نقل کرے گا کوئی اس

مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے، اپنے الفاظ میں بیان کرے گا. کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا. کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کر سکے گا. کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصے لفظ بہ لفظ نقل کر دے گا. کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی وہ نقل و روایت میں غلطیاں کریگا.

تفہیمات، جلد اوّل، شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی لاہور (صـ ۳۳۰-۳۲۹)

اقوال منسوب الی الرّسولؐ

یہ تھا وہ طریقہ جس سے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد، احادیث کے مجموعے مرتّب ہوئے. یہی وجہ ہے کہ جب آپ قرآنی آیت پڑھتے ہیں تو پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ "قال اللہ تعالیٰ" یعنی "اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے." اور جب کوئی حدیث بیان کرتے ہیں تو اس کے شروع میں کہتے ہیں "قال الرّسولؐ" (رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا) اور آخر میں کہتے ہیں. "او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم" یعنی یوں یا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہو. اور یہی وجہ ہے کہ احادیث کو اقوالِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نہیں کہا جاتا، بلکہ اقوال منسوب الی الرّسولؐ کہا جاتا ہے. یعنی وہ باتیں جو احادیث جمع کرنے والوں کے زمانے میں لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کرتے تھے.

اسمار الرّجال

ظاہر ہے کہ اس طرح احادیث کی روایت میں ایک ایک حدیث میں کتنے ہی راوی آتے ہیں. جب احادیث کے مجموعے مرتّب ہوئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ جن راویوں کا ذکر احادیث میں آتا ہے، ان کے متعلق تحقیق کیا جانا چاہیئے کہ وہ قابلِ اعتماد تھے یا نہیں. جب اس طرح ان راویوں کے متعلق طے کر لیا جائے تو پھر ایک ایک حدیث کو لے کر دیکھا جائے کہ اس کے راوی کس قسم کے ہیں. جرح و تعدیل اور اسمار الرّجال کا یہ وہ فن ہے جس کے متعلق بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی. اس میں شبہ نہیں کہ اس فن کے ائمہ نے بڑی محنت سے کام لیا لیکن سوال یہ ہے کیا اس طرح آپ کسی طرح بھی یقین کے درجے تک پہنچ سکتے ہیں؟ آپ نے جس آدمی سے کوئی بات سنی ہو اس کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قابلِ اعتماد ہے. لیکن اگر اُس بات کے بیان کرنے میں گذشتہ دو اڑھائی سو برس میں گزرے ہوئے پانچ سات آدمیوں کا ذکر ہو تو آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کا کون سا ذریعہ ہوسکتا ہے کہ وہ قابلِ

اعتماد تھے یا نہیں، اور پھر یہاں سوال صرف قابلِ اعتماد ہونے کا ہی نہیں اس امر کا یقین ہونا بھی ضروری ہے کہ وہ اتنی صلاحیت رکھتے تھے کہ بات کو اچھی طرح سمجھ لیں اور سمجھنے کے بعد اس کا صحیح صحیح مفہوم اپنے الفاظ میں آگے منتقل کر دیں۔ کہیئے کہ یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ آپ گذشتہ دو اڑھائی سو سال میں گزرے ہوئے آدمیوں کے متعلق حتم ویقین کے ساتھ یہ کچھ کہہ سکیں؟ یہ ناممکن ہے۔ چنانچہ اس باب میں سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

یہ لوگ (یعنی حدیث کو دین ماننے والے) محدثینؒ کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدّد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرّر کر دیے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار و حجّیت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں۔ محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلّم۔ یہ بھی مسلّم کہ نقدِ حدیث کے لئے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدرِ اوّل کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے۔ کلام اس میں نہیں، بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی، انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃ اللہ نے مقرّر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں، وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔

(تفہیمات، حصہ اوّل، ص۳۱۸)

پھر تحریر فرماتے ہیں:۔

محدثین کرامؒ نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا۔ جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر ان میں کون سی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۱۹)

غلطیاں بھی محض سہو وخطا کی بنا پر نہیں بلکہ اس بنا پر کہ

نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔ یہ امکان محض امکانِ عقلی

نہیں بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۱۹)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوتی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ، اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو، وہ بالیقین غیر ثقہ ہو۔ (ایضاً صفحہ ۳۲۱)

پھر فرماتے ہیں:۔

ان سب چیزوں کی تحقیق انہوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے۔ مگر لازم نہیں کہ روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں، وہ درحقیقت منقطع ہو ...... یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنتِ نبوی اور آثارِ صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔ (ایضاً صفحہ ۳۲۲-۳۲۱)

ثقاہت کا فیصلہ

جہاں تک ذاتی رجحان کا تعلق ہے، یہ ظاہر ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کے متعلق یہ فیصلہ کرے کہ وہ ثقہ تھا یا نہیں تو یہ فیصلہ کتنا ہی بے لاگ کیوں نہ ہو اس میں عام طور پر رجحاناتِ قلبی کا شائبہ آجائے گا اور قلبی رجحانات میں عقیدے کو بڑا دخل ہوتا ہے، امام بخاریؒ کو امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ اس مسئلہ میں کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں، اختلاف تھا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ امامِ اعظمؒ کو ثقہ نہیں قرار دیتے۔ پھر یہیں تک بس نہیں۔ چونکہ امام اعظمؒ کوفہ کے رہنے والے تھے اس لئے تمام کوفہ والے غیر معتبر، ناقابلِ روایتِ حدیث قرار پا گئے۔ اور کوفہ چونکہ عراق میں ہے اس لئے عراق والے بھی اسی زمرہ میں شمار ہو گئے۔ اور فیصلہ کر دیا کہ عراق والوں کی سَو حدیثوں میں سے ننانوے (۹۹) چھوڑ دو۔ جو ایک ہو تو اُسے بھی مشتبہ ہی سمجھو۔ اسی طرح ایک فرعی عقیدے کے اختلاف کی بنا پر دو جلیل القدر امام، یعنی امام

ابو زرعہ اور امام ابو حاتم نے خود امام بخاری کی ثقاہت پر اعتراض کیا ہے اور ان سے روایت ترک کر دی ہے۔ بخاری اور مسلم کی کتابوں کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ ان کی آپس میں یہ کیفیت ہے کہ امام مسلمؒ امام بخاریؒ کو مختلط الحدیث قرار دیتے ہیں۔ ان ائمۂ علوم کی اس قسم کی باہمی چشمک کی بے شمار مثالیں کتبِ روایات میں ملتی ہیں۔ عقائد کے اختلاف سے حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کے اختلاف کا سب سے بڑا مظاہرہ سنّی اور شیعہ فرقوں کا وجود ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، سُنّی حضرات کے مجموعے اپنے ہیں اور ان کا سلسلۂ روایت تابعینؒ و صحابہؓ تک پہنچتا ہے۔ جو تعلیم ان مجموعوں میں جنابِ نبیٔ اکرمؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس سے بہت ہی مختلف تعلیم احادیث کے ان مجموعوں میں ہے جو شیعہ حضرات کے پاس ہیں۔ ان کا سلسلۂ روایت بھی اسی طرح تابعینؒ و صحابہؓ تک پہنچتا ہے۔ اب یہ حضرات (کم از کم سنّی حضرات) تو یہ تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے کہ وہ بزرگانِ دین جو اُن احادیث کے راوی ہیں جو شیعہ حضرات کے مجموعوں میں داخل ہیں، وہ (نعوذ باللہ) سب جھوٹے اور غیر معتبر تھے۔ ان کو بھی لامحالہ ثقہ اور معتبر ماننا پڑے گا۔ اب صورتِ معاملہ یوں ہوئی کہ ثقہ رواۃ کی جماعت سے وہ احادیث اُمّت کو ملیں جو سُنّی حضرات کے ہاں صحیح ہیں اور ثقہ رواۃ ہی کی ایک دوسری جماعت سے وہ احادیث ملیں جو شیعہ کے ہاں صحیح ہیں، اور دونوں آپس میں ٹھہریں متناقض۔ اب کہیئے کہ کون سی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی قرار دی جائے اور اسے جزوِ دین سمجھا جائے۔ اور کون سی غلط۔ اگر کسی راوی کے ثقہ ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ اربابِ جرح و تعدیل یا جامعینِ احادیث کا ہم مسلک بھی ہو تو یہ صاف پارٹی بازی ہے، انصاف نہیں ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ جو جماعت آپ کی ہم مسلک نہ ہو، اس میں سب کے سب جھوٹے اور غیر معتبر ہوں۔ ایک چیز اور بھی دلچسپ ہے۔ خود امام بخاریؒ (اور دوسرے جامعینِ احادیث) جن بزرگوں کو ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں اور ان کی روایات مردود ٹھہراتے ہیں۔ خود ان کی ہی روایات سے اپنے مجموعوں میں احادیث، درج کر دیتے ہیں۔ (دیکھئے میزان الاعتدال از علامہ ذہبی و تدریب الراوی وغیرہ)۔

یہ تو ہیں خارجی شہادات جن سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ احادیث نہ خود نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے نزدیک جزوِ دین تھیں نہ صحابۂ کبارؓ نے انہیں ایسا سمجھا اور احادیث کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں وہ رسول اکرمؐ کے الفاظ بھی نہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر داخلی شہادات خود ان مجموعوں کے مشمولات ہیں۔ اِن میں کس کس قسم کی باتیں لکھی ہیں ان کے ذکر سے روح کانپتی ہے، ہاتھ میں قلم لرزتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا یہ بیان آپ کو بے حد تعجب انگیز اور حیرت ناک معلوم ہوگا اور ہونا بھی

داخلی شہادت

چاہیئے۔ اس لئے کہ ہمارے دلوں میں ان مجموعوں کی عزّت و عظمت قرآن کریم کے درجہ تک کی ہے۔ لہٰذا ان کے متعلق ایسی بات، یقیناً تحیّر انگیز ہو گی لیکن ہم آپ سے صرف اتنا عرض کریں گے کہ آپ نہ ہماری سنیئے نہ کسی اور کی۔ بلکہ صحیح بخاری لے کر خود مطالعہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ سے کہا جائے گا کہ ذرا سوچئے تو سہی امام بخاری علیہ الرحمۃ اتنے پائے کے امام، پھر ان کے بعد ایک ہزار سال کے عرصے میں کتنے بڑے جلیل القدر علماء عظام بزرگان کرام ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اس کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا ہے، کہیئے ایسی کتاب میں (پناہ بخدا) اس قسم کی بات ہو سکتی ہے۔ اس کے جواب میں ہم پھر یہی عرض کریں گے ان بزرگانِ سلف (علیہم الرحمۃ) کی عزّت و توقیر بجا اور درست۔ لیکن جب ہمارے پاس بخاری شریف موجود ہے تو ہم اُسے کیوں نہ ایک نظر دیکھ لیں۔ آجکل تو بخاری شریف کا اُردو ترجمہ بھی مل سکتا ہے۔ آپ عربی نہیں جانتے تو اُردو ترجمے ہی کو دیکھ لیں اور اس کے بعد خود فیصلہ فرمائیں کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ آپ کو اس میں ایسی باتیں ملیں گی جنہیں آپ کبھی جنابِ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی طرف جو انسانیت کے معراجِ کبریٰ کا مظہرِ اَتم تھی۔ وہ ہستی گرامی مرتبت (فداہ ابی و امی) جو علم و بصیرت کے افقِ اعلیٰ پر جلوہ افروز تھی۔ آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے کہ اس فخرِ موجودات، رحمۃ للعالمینؐ کی ذاتِ عظمت مآب کی طرف کس کس قسم کی باتیں منسوب کی گئی ہیں۔

یہی وجہ ہے جو سیّد ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کو کہنا پڑا کہ

> یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

مولانا ابو الکلام آزاد (مرحوم) بخاری کی اس حدیث پر تنقید کرتے ہوئے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا، لکھتے ہیں۔

> روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو بہر حال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے یقینیاتِ دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ روایت اللہ کے رسولؐ کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان

پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہوجائے گی۔

(تفسیر ترجمان القرآن از مولانا ابو الکلام آزاد، جلد دوم شائع کردہ زم زم کمپنی لاہور ص ۴۹۹-۵۰۰)

حتیٰ کہ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں ایک نومسلم یورپین کو بخاری کی حدیث پڑھا ہی نہیں سکتا۔[1]

یہ افراد کی تنقید ہے۔ پوری کی پوری حنفی جماعت، بخاری اور مسلم کی قریب دوصد احادیث کو صحیح نہیں سمجھتی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ مجموعے ظنّی ہی سہی لیکن دنیا میں کتنی ظنّی باتیں ہیں جنہیں ہم صحیح تسلیم کرتے ہیں اور ہمارا روزمرّہ کا کاروبار ہی اس بات پر چلتا ہے۔ دیکھئے آپ تاریخ کے واقعات کو مانتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی ظنّی ہوتے ہیں۔ آپ اخبارات میں خبریں پڑھتے ہیں حالانکہ وہ بھی یقینی نہیں ہوتیں۔ پھر احادیث سے کیا چڑ ہے کہ آپ انہیں یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ ظنّی ہیں۔

دین ظنّی نہیں ہوسکتا

یہ دلیل بظاہر معقول نظر آتی ہے۔ لیکن یہ دیکھنے کے بعد کہ ان دونوں باتوں میں فرق کتنا بڑا ہے، حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے۔ تاریخ یا اخبارات ہمارے لئے دین کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ میرا جی چاہے تو ایک واقعہ کو صحیح تسلیم کرلوں اور اگر اس کے خلاف میرے پاس دلائل ہوں تو یہ کہہ کر ردّ کردوں کہ مجھے اس کی صحت پر شبہ ہے۔ برعکس اس کے احادیث ہمارے لئے دین قرار دی جاتی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تنقید سے بالاتر ہیں۔ اگر مجھے ان کے متعلق ذرا سا بھی تردّد پیدا ہوجائے تو ایمان کی خیر نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے۔ مثلاً تاریخ میں لکھا ہو کہ فلاں بادشاہ نے فلاں مقام پر جھوٹ سے کام لیا۔ میں چاہوں تو اُسے صحیح تسلیم کروں اور چاہوں تو مسترد کردوں۔ نہ مجھ پر اس باب میں کوئی پابندی عاید ہوتی ہے، نہ اس سے میرے ایمان پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ لیکن جب بخاری شریف کی یہ حدیث میرے سامنے آئے کہ "حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا"۔ تو چونکہ حدیث کو جزوِ دین قرار دے دیا گیا ہے اس لئے اس کا تسلیم کرنا مجھ پر لازم ہوگیا۔ اگر صحیح تسلیم نہیں کرتا تو حدیث کے

---

[1] حوالہ ان کے اس مقالہ میں آئے گا جو اسی کتاب میں آگے جاکر درج کیا گیا ہے۔ (رسالہ الفرقان لکھنؤ، شاہ ولی اللہ نمبر ص ۲۸۷)

متعلق شک کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوتا ہوں۔ اور اگر اس کی صحت پر ایمان لاتا ہوں تو خدا کے ایک برگزیدہ نبیؑ کو (معاذ اللہ) جھوٹا سمجھنے پر مجبور ہوتا ہوں۔ یا مثلاً اخبار میں آپ دیکھتے ہیں کہ فلاں شہر میں کسی شخص نے ایک دوسرے شخص کی ناک کاٹ ڈالی، تو اسے ماننا نہ ماننا آپ کے ایمان کا جزو نہیں۔ لیکن جب آپ بخاری شریف کی اس حدیث کو پڑھیں گے کہ "جب ملک الموت حضرت موسیٰؑ کی رُوح قبض کرنے کے لئے آئے تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو ایک ایسا تھپڑ مارا کہ ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی"، تو آپ کو اس واقعہ کو صحیح ماننا پڑے گا۔ کیونکہ اس میں شک کرنے سے آپ دین میں شک کرتے ہیں۔ اس سے آپ پر واضح ہو گیا کہ دنیا کی دوسری ظنی چیزوں کے تسلیم کرنے میں اور ایک ایسی ظنی چیز کے تسلیم کرنے میں جسے آپ کے دین کا جزو قرار دیا گیا ہو، کتنا بڑا فرق ہے۔

اس کا نتیجہ

حدیث کے ظنی ہونے کا عملی نتیجہ کیا ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ جب ہم کسی معاملہ کے متعلق قرآن کریم کی کوئی آیت پیش کریں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کے ترجمہ میں اختلاف کرے، اس کے مفہوم میں اختلاف کرے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہے گا کہ معلوم نہیں یہ قرآن کی آیت ہے بھی یا نہیں۔ لیکن حدیث کی صورت میں سب سے پہلا سوال یہ زیرِ بحث آئے گا، کہ یہ قولِ رسولؐ ہے بھی یا نہیں۔ اس ضمن میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل حصہ اوّل، مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز شاہ عالم مارکیٹ لاہور، صفحہ ۲۹)

ہم نے بات یہاں سے شروع کی تھی کہ کسی بات کو دین قرار دینے کے لئے ضروری شرط یہ ہے کہ اس بات کا یقینی ہونا مسلّم ہو۔ جب یہ دعوےٰ کیا جائے کہ دین، قرآن اور حدیث دونوں کے مجموعہ کا نام ہے، تو ضروری ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک یقینی ہو۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے تو اس آیتِ قرآنی کے کلام اللہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن کا یقینی طور پر دین ہونا مسلّم ہے۔ اس کے برعکس، حدیث کی یہ کیفیت ہے کہ جب کسی حدیث کو پیش کیا جائے تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ حدیث، قولِ رسولؐ ہے

بھی یا نہیں۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں جس قدر جھگڑے ہیں وہ اسی بات سے ہیں۔ ایک فرقہ اپنے کسی عقیدہ یا مسلک کو دین کہہ کر پیش کرتا ہے اور اس کی تائید میں کوئی حدیث پیش کرتا ہے، تو دوسرا فرقہ اسے یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ یہ حدیث قولِ رسولؐ ہے ہی نہیں۔ یہ جھگڑے ہزار برس سے مسلسل چلے آ رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے مٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اس لئے کہ آج ساری امت کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے یہ یقینی طور پر متحقق ہو سکے کہ فلاں حدیث فی الواقعہ رسولِ کریمؐ کا فرمان ہے۔

ضعیف اور قوی

پھر یہ بھی دیکھئے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق یہ کوئی نہیں کہے گا کہ یہ ہے تو قرآن کی آیت لیکن ضعیف ہے۔ قوی نہیں۔ قرآن کی ہر آیت قوی ہے۔ اس میں ضعیف اور قوی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب کوئی حدیث پیش کی جائے تو فریقِ مقابل اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ چونکہ حدیثوں کی کئی قسمیں ہیں، اور مختلف فرقوں کے باہمی اختلاف اکثر و بیشتر حدیثوں کے اسی اختلاف کی بنا پر چلے آ رہے ہیں، ان کے مٹنے کی بھی کوئی صورت نہیں۔ لیکن ایسا نہیں۔

مزاج شناسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ان اختلافات کے مٹنے کی صورت موجود ہے۔ کیونکہ ایک ایسا معیار موجود ہے جس کی رُو سے حتم و یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے یا نہیں۔ یہاں تک ہی نہیں یہ بھی کہ اگر کسی معاملہ کے متعلق کسی مجموعہ میں کوئی حدیث نہ ملے تو بھی یقین کے ساتھ بتایا جا سکتا ہے کہ ایسے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے۔ آپ حیران ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تیرہ چودہ سو سال بعد وہ کونسا ذریعہ ہو سکتا ہے جس سے یہ باتیں اس حتم و یقین کے ساتھ معلوم ہو سکیں۔ آپ دیکھئے کہ وہ ذریعہ کون سا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

> جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقّہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری بصیرت، کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بہ حیثیتِ مجموعی شریعتِ حقّہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی

ہے اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات، پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی ردّ و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبویؐ کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے، وہ نبیِ اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ اس میں سے کونسا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنّتِ نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنّت سے کوئی چیز نہیں ملتی، ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح، روحِ محمدیؐ میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبویؐ کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے ڈھانچے میں ڈھل جاتا ہے، اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے۔ مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لیتا ہے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبولِ حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنٰے بھری ہوتی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات، جلد اوّل، شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی، لاہور ص ۳۲۳-۳۲۴)

آپ نے غور کیا کہ بات کیا ہوئی؟ بات یہ ہوئی کہ

(۱) یا تو آپ امام بخاری و مسلم (اور دیگر ائمہ احادیث) پر ایمان لایئے ـــــ "ایمان لایئے" کے الفاظ یونہی نہیں لکھ دیئے گئے۔ آپ کو سچ مچ اس بات پر ایمان لانا ہوگا کہ جس بات کو ان جامعین حدیث نے کہہ دیا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔ آپ ایسا نہیں کرتے تو آپ منکرِ حدیث فلہٰذا، دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

(۲) اور اگر آپ جامعین احادیث پر ایمان نہیں لاتے تو آپ کو اپنے زمانے کے کسی مزاج شناسِ رسولؐ

کی نگہِ بصیرت پر ایمان لانا ہوگا۔ یعنی یہ ماننا پڑے گا کہ جس بات کے متعلق وہ کہہ دے کہ وہ ارشادِ نبوی ہے (خواہ وہ بات کسی مجموعۂ احادیث میں موجود ہو یا اس آسمان کے نیچے کہیں بھی موجود نہ ہو) آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو آپ منکرِ حدیث، فلہٰذا، مرتد اور کافر ہیں۔

(۳) بلکہ یوں کہ اگر آپ جامعینِ احادیث کی نگہِ انتخاب پر ایمان لاتے ہیں اور مزاج شناسِ رسولؐ کی نگہِ بصیرت پر ایمان نہیں لاتے تو آپ مزاج شناسِ رسولؐ کے نزدیک منکرِ حدیث، فلہٰذا، کافر ہیں اور اگر آپ مزاج شناسِ رسولؐ کی نگہِ بصیرت پر ایمان لاتے ہیں اور اس طرح بخاری یا مسلم کی کسی حدیث کے صحیح ہونے سے انکار کرتے ہیں تو آپ اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک منکرِ حدیث، فلہٰذا کافر ہیں۔

یعنی خدا نے تو آپ کو (مسلمان ہونے کے لئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے کے لئے کہا تھا لیکن اب صورت یہ ہے کہ جب تک آپ اِن انسانوں پر ایمان نہیں لائیں گے آپ مسلمان، نہیں کہلا سکیں گے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

حدیث کے متعلق عقیدہ

یہ تو ہے حدیث کی پوزیشن۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کے متعلق ہمارے ہاں عقیدہ کیا چلا آ رہا ہے؟ اسے ذرا غور سے سنیئے۔ اور پھر سوچیئے کہ اس قسم کی ظنّی چیز کے متعلق اس قسم کے عقائد دین میں غلو نہیں تو اور کیا ہے؟ مولانا محمد اسماعیل مرحوم (سابق صدر جمعیت اہلِ حدیث) اپنے رسالہ "جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث" مطبوعہ گوجرانوالہ، میں لکھتے ہیں:۔

> تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا، ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا........
>
> جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنّت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملّت سے خروج کے مطابق۔ (ص۴۸)

یعنی جو احادیث فرقۂ اہلِ حدیث کے نزدیک صحیح ہیں ان میں سے کسی ایک حدیث کا انکار (یعنی یہ کہنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں ہے) کفر ہے اور ایسا کہنے والا اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس فرقہ کے نزدیک بخاری اور مسلم صحیحین ہیں اس لئے ان کی کسی حدیث کا انکار کفر ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> بخاری اور مسلم کی احادیث پر اُمت متفق ہے.......... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (ص۵۵)

"اُمت" سے مراد ہے فرقہ اہلِ حدیث۔ کیونکہ (اور تو اور) حنفی حضرات (جو امت کی اکثریت کا فرقہ ہے) بخاری اور مسلم کی کم از کم دو سو احادیث کو صحیح نہیں مانتے۔

ان احادیث کا انکار کفر کیوں ہے؟ اس کے متعلق مولانا اسماعیل مرحوم فرماتے ہیں۔

حدیث بھی وحی ہے

> جبریل، قرآن اور سنت دونوں لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ (ص۶)

یعنی قرآن اور حدیث دونوں وحیٔ خداوندی ہیں اور دونوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ اس کے لئے ایک روایت وضع کی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ پر قرآن بھی نازل ہوتا ہے اور مثلہٗ معہٗ (اس کے ساتھ اس جیسی) ایک اور چیز (حدیث بھی)۔ ایک اور عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ وحیٔ جلی (قرآن) اور وحیٔ

وحی کی دو قسمیں

خفی (حدیث)۔ وحیٔ جلی کو وحیٔ متلو بھی کہتے ہیں (یعنی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور وحیٔ خفی کو وحیٔ غیر متلو (یعنی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی ہے) واضح رہے کہ وحی کی ان دو قسموں کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں حتّٰی کہ حدیث کے اوّلین لٹریچر میں بھی اس اصطلاح کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا۔ یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شبِ کتب (جو لکھی جائے) اور دوسری قسم شبعلفہ (جو لکھی نہ جائے، روایتاً آگے منتقل ہو) ان حضرات نے اس عقیدہ کو یہودیوں کے ہاں سے مستعار لیا اور اسے عین دین بنا کر پیش کر دیا۔ ہم اس مقام پر اس بحث کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ یہ عقیدہ کس طرح قرآنِ کریم کی ضد ہے اور اس سے کس طرح دین کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔ ہم صرف پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر حدیث بھی قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل" خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی تھی تو وحی کی حفاظت کا ذمہ تو خود خدا نے لیا تھا۔ اس وحی (یعنی حدیث) کو خدا نے محفوظ کیوں نہ رکھا (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں)

اسے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محفوظ کر کے امت کو دیا۔ نہ خلفائے راشدینؓ نے اسے منضبط اور محفوظ کیا۔ نہ صحابہؓ میں سے کوئی اور اسے ضبطِ تحریر میں لایا۔ جس نے اپنے طور پر کچھ لکھا تھا اسے بھی جلا' یا جلوا دیا۔ اگر حدیث اور قرآن دونوں وحی تھے تو وحی کے ایک حصہ (قرآن) کی حفاظت کا وہ اہتمام اور اس کے دوسرے حصہ

حدیثیں کیوں نہ لکھی گئیں

(حدیث) سے بے اعتنائی بلکہ مخالفت؟ کیا یہ بات کسی طرح بھی سمجھ میں آسکتی ہے؟ ضمناً اس اعتراض کا جواب بھی سُن لیجئے کہ حدیث اگر وحی تھی تو اسے قرآن کے اندر شامل کیوں نہ کر دیا گیا۔ مودودی صاحب اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ اگر ایسا کر دیا جاتا تو

> اس سے قرآنِ مجید کم از کم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا۔
>
> (تفہیمات' حصہ اول' ص ۲۳۶)

یعنی چونکہ اس طرح قرآن کی ضخامت بہت بڑھ جاتی اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وحی کے اس حصہ کو قرآن میں شامل کر دیا جائے۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ بہت اچھا۔ قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کے خدشہ کی وجہ سے اسے قرآن میں شامل نہ کیا جائے تو اسے ایک علیٰحدہ جلد میں کیوں نہ لکھ لیا گیا۔ تو اس کے متعلق فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ

> اُس وقت لکھنے پڑھنے والے کم تھے اور سامانِ کتابت اور بھی زیادہ کمیاب تھا۔
>
> (ماہنامہ ترجمان القرآن' لاہور' بابت مارچ ۱۹۵۴ء)

یہ جواب مودودی صاحب کا ہے۔ لیکن حیدر آباد (دکن) کے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (جو اب پیرس میں مقیم ہیں) اس کی وجہ کچھ اور بتاتے ہیں وہ اپنے ایک مقالہ میں (جو کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی رسالہ الاسلام کی یکم و پندرہ جنوری ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) لکھتے ہیں۔

> نبیٔ اکرمؐ بہ حیثیت انسان اپنے افعال میں محتاط اور (MODEST) واقعہ ہوئے تھے۔ بہ حیثیت رسولِ خدا انہوں نے اس امر کے لئے ہر ممکن اور ضروری اقدامات کر لئے تھے کہ خدا کا پیغام یعنی قرآن' نہ صرف لوگوں تک پہنچا دیا جائے بلکہ اسے محفوظ بھی کر دیا جائے۔ اگر وہ اپنے اقوال کی حفاظت کے لئے بھی اس قسم کے اقدامات کرتے تو بعض لوگ اسے انانیت پر محمول کرتے۔ اس وجہ سے حدیث کی کہانی قرآن سے مختلف ہے۔

یہ ہے اس "وحی" کی کہانی جو قرآن کے ساتھ' قرآن کی مثل قرار دی جاتی ہے جسے جبریل اسی طرح لے کر نازل ہوتے تھے جس طرح قرآن کریم کو اور جس کے انکار سے اسی طرح کفر لازم آتا ہے جس طرح قرآن کے انکار سے.
یا للعجب!

حدیث، قرآن سے اونچی ہے

یہاں تک تو ہم نے دیکھا ہے کہ اتنا ہی کہا جا رہا ہے کہ حدیث' قرآن کی مثل ہے. یعنی دونوں ہم پایہ ہیں. لیکن اب ذرا آگے بڑھئے. امام اوزاعی کا قول ہے کہ

> قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں[1]

یعنی اگر قرآن اور حدیث باہم وگر متعارض ہوں تو جو فیصلہ حدیث دے اسے قبول کرنا چاہیئے نہ کہ اس فیصلہ کو جو قرآن دے.

حدیث، قرآن کو منسوخ کرسکتی ہے

اتنا ہی نہیں' ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حدیث' قرآن کے حکم کو منسوخ کر سکتی ہے. علامہ حافظ محمد ایوب مرحوم اپنے کتابچہ "فتنۂ انکارِ حدیث" مطبوعہ کراچی' میں لکھتے ہیں.

> نبی کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو' تب حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے........ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (۲/۱۸۰) "تمہارے اُوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا. لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ. وارث کے لئے وصیت نہیں ہے. اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے. یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی ؛ حدیث نے قرآن کو منسوخ کردیا اور قولِ رسولؐ' قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا. (ص۸۵)

---

[1] مختصر جامع بیان العلم' مصنف حافظ ابن عبد البرؒ مطبوعہ قاہرہ' ص۲۲۳

جو لوگ اس قدر متشدد نہیں، وہ کہتے ہیں کہ حدیث درحقیقت قرآن کے احکام کی تشریح اور تفسیر بیان کرتی ہے۔ اس میں قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل ملتی ہے۔ لیکن یہ لوگ محض اعتراض کا جواب دینے کے لیے ایسا کہتے ہیں۔

حدیث مستقل دین ہے

ان کا عقیدہ اس سے مختلف ہے۔ یہ جب حدیث کو، قرآن کی مثل قرار دیتے ہیں۔ تو اس سے جو لازمی نتیجہ نکلتا ہے اس سے انکار نہیں کرتے۔ یہ حدیث کو قرآن کی تفسیر نہیں مانتے بلکہ قرآن کی طرح مستقل دین مانتے ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب اس باب میں لکھتے ہیں۔ (یعنی وہی مودودی صاحب جن کی حدیث پر تنقید ہم پہلے دیکھ چکے ہیں)۔

> حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسّر کی ہے یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آ گیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے...... مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔
>
> (ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور بابت جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۵۰ء)

آپ نے غور فرمایا کہ حدیث کے متعلق عقیدہ کیا ہے۔ یہ کہ

(۱) حدیث اور قرآن دونوں خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔

(۲) حدیث قرآن کے ساتھ اس کی مثل ہے۔

(۳) حدیث قرآن کی اتنی محتاج نہیں جتنا قرآن حدیث کا محتاج ہے۔

(۴) حدیث قرآن پر قاضی ہے۔

(۵) یہ قرآن کی مفسّر اور شارح نہیں بلکہ دین کے احکام میں مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

(۶) حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

اور

(۷) جو شخص ایسا عقیدہ نہ رکھے وہ منکرِ حدیث، فلہٰذا، کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

قرآن کی تفسیر

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا۔ آپ نے اُسے صحابہؓ کو سمجھایا۔ لہٰذا قرآن کی جو تفسیر حضورؐ نے بیان فرمائی تھی، اس سے بہتر تفسیر اور

کس کی ہوسکتی ہے؟ اس لئے اگر کوئی شخص قرآن کی کسی آیت کا مطلب اس سے مختلف لیتا ہے جو مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا تو اس کا مطلب صحیح نہیں ہو سکتا۔

یہ بات بڑی معقول نظر آتی ہے۔ اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ قرآن کا جو مطلب نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا وہی صحیح ہو سکتا ہے۔ اس سے مختلف مطلب صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کی جو تفسیر احادیث میں بیان ہوئی ہے کیا وہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ ہے؟ اس سلسلہ میں پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ پورے قرآن کی تفسیر احادیث میں بیان ہی نہیں ہوئی۔ اس کی بہت تھوڑی سی آیات کی تفسیر بیان ہوئی ہے بخاری میں تفسیر کا صرف ایک باب ہے اور اس میں چند جستہ جستہ آیات کی تشریح آئی ہے۔

پھر یہ تفسیر کس قسم کی ہے اس کی کچھ مثالیں آپ کو اس مضمون میں ملیں گی جو چند صفحات آگے چل کر "تفسیر بالروایات" کے عنوان سے آپ کے سامنے آئے گا۔ ان مثالوں سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس قسم کی تفسیر کسی صورت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوسکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ تفسیر کی روایات کے متعلق امام احمدؒ نے کہا تھا کہ ان کی کوئی اصلیت نہیں۔

پھر سُن لیجئے کہ اگر قرآن کی کسی آیت کی تفسیر کے متعلق یقین سے کہا جاسکے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تو اس کے سامنے کون سے مسلمان کا سر نہیں جھکے گا؟ لیکن جب یہ واقعہ ہو کہ آپ کسی حدیث کے متعلق بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ قولِ رسولؐ ہے۔ تو اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ قرآن کی یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تفسیر سے انکار نہیں کرتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے صرف یہ ہے کہ جس تفسیر کو رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے نہیں۔ ذرا سوچئے کہ اگر امام بخاریؒ پانچ لاکھ چورانوے ہزار حدیثوں کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ ان کی دانست میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہو سکتیں، اور اس سے وہ منکرِ حدیث قرار نہیں پائے تو اگر آج کوئی شخص ایک حدیث کے متعلق کہتا ہے کہ اس کی بصیرتِ قرآنی کی رُو سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہوسکتی، تو وہ کافر اور خارج از اسلام کس طرح قرار پا سکتا ہے؟ وہ درحقیقت ایک جامع حدیث کے فیصلے یا راوی کی روایت کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہے، ارشادِ نبویؐ سے انکار نہیں کرتا۔ وہ قولِ رسولؐ سے انکار نہیں کرتا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جس قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا قول نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں۔

اب ہم اس اعتراض کی طرف آتے ہیں جو بظاہر بڑا وقیع نظر آتا ہے اور جو اکثر لوگوں کے دل میں وجہ اضطراب بنتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر ہم حدیث کو مانیں تو قرآن کریم کے احکام پر عمل کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

حدیث کو نہ مانیں تو نماز کیسے پڑھیں

مثلاً قرآن کریم میں نماز کا حکم ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ نماز کیسے پڑھی جائے۔ اس کی کتنی رکعتیں ہوں۔ ہر رکعت میں کیا کیا پڑھا جائے، وغیرہ وغیرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے اس حکم پر عمل کر کے دکھایا اور اسی کے مطابق ہمیں عمل کرنا چاہیئے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ یہ کہنا کس قدر مبہم ہے کہ "اگر ہم حدیث کو نہ مانیں تو........" حدیث کے وجود سے کون انکار کرتا ہے، احادیث کے مجموعے ہر جگہ ملتے ہیں۔ کہنا یہ چاہیئے کہ اگر ہم احادیث کو یقینی طور پر رسول اللہ کے اقوال و افعال کا ریکارڈ تسلیم نہ کریں تو پھر (مثلاً) ہم نماز کس طرح سے پڑھیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ احادیث کو یقینی ماننے کے بعد بھی نماز کس طریق سے پڑھیں؟ یہ آپ کو معلوم ہے کہ شیعہ حضرات کی نماز سنی حضرات سے مختلف ہے۔ اور شیعہ اور سنی دونوں اپنی اپنی نماز کے متعلق دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مطابق ہے۔ پھر سنی حضرات کی طرف آئیے تو اہلِ حدیث کی نماز اور حنفیوں کی نماز میں جس قدر فرق ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ اور یہ دونوں فرقے بھی اپنی اپنی نماز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے عین مطابق قرار دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان نمازوں میں سے کون سی نماز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی نماز تسلیم کیا جائے جبکہ ہر ایک کی نماز اور اس کی جزئیات کی سند میں احادیث موجود ہیں۔ کیا آج کوئی ایسا طریقہ معلوم کیا جا سکتا ہے جس سے یقینی طور پر متحقق ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح نماز ادا فرمائی تھی!

کہہ دیا جاتا ہے کہ (شیعہ حضرات کی نماز سے قطعِ نظر) سنیوں کے مختلف فرقوں کی نماز میں جو اختلاف ہے وہ فروعی سا ہے۔ اصولی طور پر سب کے ہاں نماز مشترک ہے اور ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت نہیں۔

سو اوّل تو یہی غلط ہے کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ ان فرقوں کے پیروکار کسی دوسرے فرقے والوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا تو کجا اگر (مثلاً) نیچی آواز سے آمین کہنے والا اونچی آواز سے آمین کہنے والوں کی مسجد میں جا کر نماز پڑھ لے تو وہ، اگر اپنی مسجد کا فرش اکھیڑ نہیں دیں گے، تو کم از کم اسے دس بار دھو کر پاک اور صاف ضرور کریں گے۔ یہ جو آئے دن "وہابیوں اور بدعتیوں" یا بریلیوں اور دیوبندیوں کی مسجدوں میں تنازعے

ہوتے ہیں ــــ امام قتل کر دیئے جاتے ہیں. مقتدیوں میں دنگا فساد ہوتا ہے. پولیس مداخلت کرتی ہے. مسجد پر تالا پڑ جاتا ہے اور مقدمہ عدالت میں پہنچ جاتا ہے ــــ تو یہ نماز کے انہی فروعی اختلافات کی وجہ سے ہوتا ہے ــــ لہٰذا' یہ کہنا کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں' حقیقت کا بطلان اور محض اعتراض سے بچنے کے لئے فرار کی راہ اختیار کرنے کے مترادف ہے.

پھر یہ بھی دیکھئے کہ جب کسی حکم کو خدا (یا اس کے رسولؐ) کا متعین فرمودہ قرار دیا جائے تو اس کے اصول اور فروع سب اپنی اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی اختلاف نہیں کیا جا سکتا. مثلاً قرآنِ کریم نے وضو کے سلسلہ میں کہا ہے. فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ.........(۵/۶) اپنے مُنہ دھویا کرو. اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک. اب اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ پہنچوں تک دھوئے' اور دوسرا کہنیوں تک' تو کیا آپ کہہ دیں گے کہ یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک. کیونکہ یہ فرق محض فروعی ہے اصولی نہیں؟ ایسا کہنا صریحاً غلط ہوگا. ان میں سے ٹھیک ایک ہی ہو سکتا ہے. اور وہی ٹھیک ہو سکتا ہے جس کا عمل قرآن کے حکم کے مطابق ہو. لہٰذا' نماز کی جو جزئیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے متعیّن فرمائی تھیں' جب تک ان کی بعینہٖ پابندی نہیں کی جائے گی' نماز' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نماز کے مطابق قرار نہیں پائے گی. یہ کہنا کہ کسی نے ہاتھ کانوں تک اٹھالئے یا نیچے رکھے. ہاتھ سینے تک باندھ لئے یا زیرِ ناف. آمین بالجہر کر لی یا خفی. پاؤں میں اتنا فاصلہ رکھ لیا یا اُتنا. امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھی یا نہ پڑھی' یا فلاں دُعا یوں پڑھ لی یا یوں. تراویح آٹھ پڑھ لیں یا بیس. عید کی نماز میں تکبیریں اتنی کہہ لیں یا اُتنی. نماز فلاں وقت پڑھ لی یا فلاں وقت. اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ جزئیات کا فرق ہے. محض اعتراض سے بچنے کا بہانہ ہے. اگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تو (مثلاً) کسی اہلِ حدیث سے کہیئے کہ وہ حنفیوں کی سی نماز پڑھ کر اعلان کر دے کہ اس کی نماز ہو گئی ہے؟ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا.

لہٰذا سوچیئے کہ کیا احادیث کو یقینی مان لینے کے بعد آپ یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ نماز کا فلاں طریقہ ٹھیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے طریقہ کے مطابق ہے؟ ہاں! ہر ایک فرقہ یہ کہہ سکتا ہے' اور کہتا ہے کہ اس کا طریقہ عین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے طریقہ کے مطابق ہے. لیکن کیا آپ یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے طریقہ کے مطابق ہو سکتا ہے؟ کیا آپ اسے باور کر سکتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں کچھ لوگ شیعوں کی سی نماز پڑھتے تھے اور کچھ سنّیوں کی سی. یا کچھ لوگ اہلِ حدیث کی سی نماز پڑھتے

تھے اور کچھ حنفیوں کی سی. یا خود رسول اللہ کی یہ کیفیت تھی کہ آپؐ کبھی اس طریق سے نماز پڑھتے اور پڑھاتے تھے جس طریقہ کے مطابق آج شیعہ نماز پڑھتے ہیں اور کبھی اس طریق کی نماز جیسی نماز آج سنّی پڑھتے ہیں اور کبھی اہلِ حدیث کے طریقہ جیسی نماز اور کبھی حنفیوں کی سی نماز! ظاہر ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا ہوگا. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک ہی جیسی نماز پڑھتے اور پڑھاتے ہوں گے اور ساری اُمّت ایک جیسی نماز پڑھتی ہوگی. دین میں اختلاف کی گنجائش نہیں. اختلاف کو قرآنِ کریم اللہ کا عذاب اور فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے.

جب صورت یہ تھی تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا اب ایسی صورت کسی طرح بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ امّت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو جائے اور تمام مسلمان ایک جیسی نماز پڑھنے لگ جائیں؟ ظاہر ہے کہ جب تک آپ

ایک نومسلم کیا کرے

احادیث کو یقینی اقوال وافعالِ رسول اللہؐ تسلیم کرتے رہیں گے' اس وقت تک اُمّت میں وحدت پیدا کرنا ناممکن ہے. اس لئے کہ ہر فرقہ کی اپنی اپنی احادیث ہیں اور ہر فرقہ اپنی حدیثوں کو یقینی طور پر اقوال وافعالِ رسول اللہؐ قرار دیتا ہے. ساری امّت میں وحدت پیدا کرنا تو ایک طرف' موجودہ حالات میں تو ایک اور مشکل ایسی پیدا ہوتی ہے جس کا کوئی حل ہی نہیں. ایک نومسلم آج مسلمان ہوتا ہے. اور جس شخص کے ہاتھ پر وہ اسلام لاتا ہے وہ اتّفاق سے (مثلاً) دیوبندی ہے. مسلمان ہونے کے بعد اسے بتایا جاتا ہے کہ اسلام کا سب سے پہلا رکن ـــ اور کفر واسلام میں وجہِ تفریق ـــ نماز ہے. وہ اُن مولوی صاحب سے نماز سیکھتا ہے اور انہی کے طریقہ کے مطابق نماز پڑھنے لگ جاتا ہے. لیکن ایک اہلِ حدیث مولوی صاحب اسے نماز پڑھتے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی. اور ظاہر ہے کہ جب نماز ہی نہ ہوئی ہو تو وہ مسلمان کیسے رہا کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ کفر اور اسلام میں مابہ الامتیاز نماز ہے ـــ سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس نومسلم کی اس مشکل کا کوئی حل بتا سکتے ہیں؟ سوچئے کہ یہ گہری سوچ کا مقام ہے. اس سے یونہی آگے نہ بڑھ جایئے. احادیث اس مشکل کا کوئی حل پیش نہیں کر سکتیں اس لئے کہ یہ مشکل تو پیدا ہی احادیث کی کی ہوئی ہے! اس مشکل کا صحیح حل کیا ہے. اسے ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا.

بحثِ سنّت

حدیث کے علاوہ' ایک لفظ سنّت ہے جو حدیث سے بھی زیادہ مروّج ہے. اور اس کا تعلق انتہائی

نازک جذبات سے ہے۔ " اتباعِ سنّتِ رسولؐ اللہ عین دین ہے" یہ الفاظ ہر طرف سے سنائی دیں گے لیکن یہ معلوم کرکے آپ حیران ہوں گے کہ سنّت کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے، اس کے متعلق بھی ہمارے علماء حضرات متفق نہیں۔ چند ہی سال ادھر کا ذکر ہے کہ صدر جمعیت اہلِ حدیث مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) نے ایک رسالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا " جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث"۔ اس میں انہوں نے مودودی صاحب (اور ان کے ہمنواؤں) کے مسلکِ حدیث پر سخت تنقید کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ حضرات "سنّت" سے جو مفہوم لیتے ہیں اس سے ان کے مسلک کے ڈانڈے منکرینِ حدیث سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے رسالہ میں منکرینِ حدیث کی جو فہرست شائع کی تھی اس میں سرسید، مولانا شبلی، مولانا حمید الدّین فراہی کے ساتھ مودودی صاحب، امین احسن اصلاحی صاحب اور فرزندانِ ندوہ کو بھی شامل کیا تھا۔ اگرچہ ان کے متعلق لکھا تھا کہ

> یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں لیکن ان کے اندازِ فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہے اور طریقہ گفتگو سے انکار کے لئے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔

مولانا اسماعیل مرحوم نے تحریر فرمایا تھا کہ سنّت اور حدیث مرادف الفاظ ہیں۔ یعنی حدیث ہی کو سنّت کہا جاتا ہے۔ ان کی اس تعریف کی رُو سے "کتاب و سنّت" کے معنی ہوں گے "قرآن و حدیث"، لیکن مودودی صاحب کے نزدیک سنّت کا مفہوم اس سے الگ ہے۔ وہ اپنی کتاب "رسائل و مسائل" (حصہ اول) میں لکھتے ہیں:

مودودی صاحب کے نزدیک

> سنّت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں۔ جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دَور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جز سنّت ہے اور کون سا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو .... تمدّن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی

مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنّت بنا دینا مقصود نہ تھا۔

(صـ۳۱۱ تا صـ۳۱۷)

اسی کتاب میں وہ صـ۳۱۴ پر لکھتے ہیں:۔

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپؐ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنّت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبیؐ پہنتے تھے اور شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے سے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنّت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنّت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنّت قرار دے لینا منجملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی مولانا اسماعیل مرحوم کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک صحیح احادیث میں سے وہ باتیں سنّت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبیٔ اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنّت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے۔

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنّت قرار دینا اور پھر ان کے اتّباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً صـ۳۰۸)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں:۔

جو امور آپؐ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنّت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں

تحریف ہے۔ (صنت۳۰)

ان تصریحات کی روشنی میں، ایک عملی شکل کو سامنے لائیے کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھ دی گئی ہے کہ یہاں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو "کتاب وسنت" کے خلاف ہو۔ ایک قانون ملک میں نافذ ہوجاتا ہے۔ مولانا اسماعیل

اس کا نتیجہ

مرحوم یا ان کے ہم عقیدہ حضرات چیلنج کرتے ہیں کہ وہ "سنت" کے خلاف ہے اس لئے وہ قانون ناجائز، اس کی تائید میں وہ ایک حدیث پیش کردیتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مودودی صاحب کہتے ہیں کہ وہ قانون سنت کے خلاف نہیں۔ اوّل الذکر حضرات دریافت کرتے ہیں کہ انہوں نے جو حدیث پیش کی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟ مودودی صاحب جواب دیتے ہیں کہ وہ حدیث تو صحیح ہے لیکن رسولؐ اللہ نے وہ عمل، اپنی بشری حیثیت سے عادۃً فرمایا تھا، رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں کیا تھا۔ وہ پوچھتے ہیں کہ اس کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ حضورؐ نے وہ کام عادتاً کیا تھا۔ مودودی صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ایسے معاملات کا فیصلہ سند اور دلیل کی مدد سے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا فیصلہ "مزاج شناسِ رسول" ہی کرسکتا ہے (تفصیل پہلے گزرچکی ہے)۔

فریقِ ثانی اس کے جواب میں کہتا ہے:۔

> اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول کا مزاج شناس تصوّر کرلے، پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرلے۔ جسے چاہے ردّ کردے۔ یا کوئی عالم یا قائد بلاوجہ کسی موضوع یا مختلف مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعوےٰ کردے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔
>
> (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، مصنفہ مولانا اسماعیل السلفی مرحوم، مطبوعہ گوجرانوالہ صلا)

یعنی جس چیز کو مودودی صاحب سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیتے ہیں، اسے اہلِ حدیث حضرات سنت کے خلاف ہوائی حملے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور سنت کو ایسے حملوں سے محفوظ رکھنے کو اپنا فریضہ قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک

اصلاحی صاحب

بات صرف مودودی صاحب اور مولانا اسماعیل مرحوم کے درمیان تھی۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اس باب میں لکھتے ہیں:۔

حدیث تو ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبیؐ کی نسبت کے ساتھ کی جائے!
لیکن سنّت سے مراد نبیؐ کا صرف ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر آپؐ نے بار بار عمل کیا ہو.
جس کی آپؐ نے محافظت فرمائی ہو. جس کے حضورؐ عام طور پر پابند رہے ہوں. (ایضاً ص۲۵)

اس کے متعلق مولانا اسماعیل مرحوم فرماتے ہیں:۔

مولانا (اصلاحی) نے سنّت کی تعریف کو اس قدر سکیڑ دیا ہے کہ اس کا تعلق صرف چند اعمال سے ہی ہوگا جن کا ثبوت آنحضرتؐ سے علیٰ سبیل الاستمرار ہے جیسے نماز کے بعض ارکان..... ہزار دفعہ فرمایا جائے کہ "اگر کوئی شخص اس سنّت کو ماخذ دین تسلیم نہیں کرتا تو میں اسے مسلمان تسلیم نہیں کرتا." سوال یہ ہے کہ اس سنّت کی پہنائی ہے کہاں تک — اس کا احاطہ چند اعمال سے آگے نہیں بڑھے گا. پورا اسلام تو کسی دوسری جگہ سے ہی ثابت کرنا ہوگا. پھر اس اِدعا کی ضرورت ہی کیا ہے. (ایضاً ص۲۶)

یہ ہے "سنّت" کی تعریف کے متعلق ان حضرات کا وہ اختلاف جس کی بنا پر مولانا اسماعیل مرحوم نے کہا تھا کہ:۔

میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلکِ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمۂ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں. ان میں آج کے جدید اعتزال و تجہم کے جراثیم مخفی ہیں. (ایضاً ص۱۱)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "کتاب وسنّت" کا متفقہ مطالبہ کرنے والوں میں اس امر پر بھی اتفاق نہیں کہ "سنّت" کہتے کسے ہیں؟ جو چیز ایک کے نزدیک "سنّت" ہے وہ دوسرے کے نزدیک "بدعت" اور دین میں "تحریف" ہے.

جب علماء کرام نے مطالبہ کیا کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق درج کی جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو "کتاب وسنّت" کے خلاف ہو تو ہم نے کہا کہ اس شرط کے مطابق کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے مسلمانوں کے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں. اس لئے کہ "کتاب" (قرآنِ مجید) ہر فرقے کے نزدیک متفق علیہ ہے لیکن "سنّت" ہر فرقہ کی الگ الگ ہے. اس پر شور مچا دیا گیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ سنّت ہے.

(لے فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

منکرِ شانِ رسالت ہے۔ کافر ہے۔ مرتد ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کامل بیس برس تک یہ حضرات طلوعِ اسلام کو کافر و مرتد کہتے رہے لیکن کتاب و سنّت کی رُو سے نہ کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکتا تھا، نہ مرتب ہوا، بالآخر مودودی صاحب کو اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ

> کتاب و سنّت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لا کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (ہفت روزہ ایشیا، لاہور، مورخہ ۲۲ر اگست ۱۹۷۰ء)

اس سے واضح ہے کہ جب تک اسلام، مختلف فرقوں میں بٹا رہے گا، ہر فرقہ اپنی اپنی صوابدید (یا معیار) کے مطابق سنّت کا اتباع کرتا رہے گا۔ لیکن جونہی آپ اُسے وحدتِ امّت کی اجتماعی شکل دینے کی کوشش کریں گے (موجودہ تصور کے مطابق) اتباعِ سنّت ناممکن ہو جائے گا۔

اس سے وہ گوشہ سامنے آتا ہے جو اس ساری بحث کا محور یا مرکز ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ــــ اور بار بار حکم ــــ کہ تم رسولؐ کی اطاعت کرو۔ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی۔ جس نے رسولؐ کی اطاعت سے سرتابی کی وہ سیدھا جہنّم میں جا پہنچا۔ لہٰذا یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر احادیث کو نہ مانا جائے تو پھر رسولؐ اللہ کی اطاعت کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

اطاعتِ رسُول کیسے کی جائے؟

یہی ہے وہ سب سے اہم اور بنیادی سوال جو اس سلسلہ میں سامنے لایا جاتا ہے اور اس طرح احادیث کو اقوال و افعالِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ماننے اور ان کے مطابق عمل کرنے کو قرآن کی رُو سے ثابت کیا جاتا اور ایمان اور اسلام کا بنیادی تقاضا قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سوال واقعی بڑا اہم اور اس قابل کہ اس پر نہایت سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سوال کے جواب تک آئیں خود اس سوال کے ایک بنیادی سقم پر غور کرنا ضروری ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ

(۱) چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت از رُوئے قرآن فرض ہے۔

(۲) اور رسول اللہ کی اطاعت کا ذریعہ احادیث کے علاوہ کوئی نہیں۔

(۳) اس لئے ضروری ہے کہ ہم احادیث کو یقینی طور پر اقوال و افعالِ رسولؐ اللہ تسلیم کریں۔ یعنی

(سابقہ صفحہ کا فٹ نوٹ) یہاں ہم نے شیعہ حضرات کے مسلک سے بحث نہیں کی۔

اگرچہ احادیث کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وہ ظنی ہیں یقینی نہیں. لیکن چونکہ انہیں یقینی مانے بغیر اطاعت رسولؐ کا فریضہ ادا نہیں ہوسکتا' اس لئے ضروری ٹھہرا کہ انہیں یقینی مانا جائے. اس دلیل کا بوداپن بالبداہت واضح ہے. یہ وہی بات ہے جیسے کسی نے کہا تھا.

زذوقِ بندگی' پروردگارے کردہ ام پیدا

اب آیئے اصلی سوال کی طرف. حقیقت یہ ہے کہ حدیث (بلکہ نفسِ اسلام) کے بارے میں جس قدر الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں' ان سب کی بنیادی وجہ "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" کے صحیح مفہوم کا نگاہوں سے اوجھل ہوجانا ہے. اس سے عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی دو الگ الگ اطاعتیں ہیں. اللہ کی اطاعت قرآن کے ذریعے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت احادیث کے ذریعے. سو اوّل تو یہ بنیاد ہی صحیح نہیں کہ اطاعتیں دو ہیں. قرآن کریم کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اطاعت صرف خدا کی کی جاسکتی ہے. اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت جائز نہیں.

دوسرے یہ کہ اگر رسولؐ کی اطاعت کا ذریعہ احادیث تھیں تو (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے) یہ نہایت ضروری اور دین کا اوّلین تقاضا تھا' کہ قرآن کی طرح احادیث کو بھی' خدا کی ضمانت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے فریضۂ رسالتؐ کے تقاضا کی رُو سے' ہر طرح سے محفوظ کیا جاتا. تاکہ ہر شخص یقینی طور پر رسولؐ کی اطاعت کرسکتا. جس طرح خدا کی اطاعت سے یہ مقصد نہیں کہ جن باتوں کو ہم اپنے تصوّر کے مطابق خدا کے احکام قرار دے لیں' ان کی اطاعت کرلیں. خدا کی اطاعت سے مقصود ہے' خدا کی کتاب کی اطاعت. جس کی حفاظت کا ذمّہ خود خدا نے لیا اور جسے محفوظ اور منضبط شکل میں' رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم نے امّت کو دیا' اور وہ اُمّت کے پاس اسی طرح محفوظ چلا آرہا ہے. اسی طرح رسولؐ کی اطاعت سے بھی یہ مقصود نہیں ہوسکتا کہ جن باتوں کو ایک فرد یا ایک فرقہ اپنے طور پر احکام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم سمجھ لے' ان کی اطاعت کرلے. اطاعت کے لئے متعیّن اور یقینی احکام کا ہونا نہایت ضروری ہے. لہٰذا خود یہ حقیقت کہ احادیث کی حفاظت کا ذمّہ نہ خدا نے لیا اور نہ ہی انہیں رسولؐ اللہ نے منضبط اور محفوظ کرکے اُمّت کو دیا' اس امر کی بدیہی شہادت ہے کہ احادیث کی رُو سے اطاعتِ رسولؐ نہ منشائے خداوندی تھا نہ مقصودِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم.

اس سے پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اطاعتِ رسولؐ احادیث کے ذریعے نہیں ہوسکتی تو پھر اس کا ذریعہ

اور طریقہ کیا ہے؟

اصل یہ ہے کہ اسلام، (عام تصور کے مطابق) مذہب نہیں جس میں ہر شخص، اپنے اپنے طور پر احکام کی اطاعت کر لیتا ہے. اسلام، ایک اجتماعی نظامِ زندگی ہے جس میں اطاعت، نظامِ مملکت کے ذریعے اجتماعی طور پر کی جاتی ہے. اسلامی مملکت یا نظام، خدا کے احکام نافذ کرنے، یا لوگوں سے ان کی اطاعت کرانے کا ذمہ دار ہوتا ہے. اسی قسم کا نظام سب سے پہلے نبیٔ اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا جس کا مقصد امّت سے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرانا تھا. اس لئے قرآن کی اصطلاح "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" کا مطلب تھا، خدا کے احکام کی اطاعت، اپنے اپنے طور پر نہیں بلکہ اُس نظام کے ذریعے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا ہے. خدا کے احکام قرآنِ کریم میں منضبط تھے اور رسولؐ اللہ بہ حیثیت مرکزِ نظامِ خداوندی ان احکام کی اطاعت، حالات کے تقاضے کے مطابق، افرادِ معاشرہ سے کراتے تھے.

اسلام ایک اجتماعی نظام ہے

دوسری قابلِ غور یہ حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم میں کچھ احکام دیئے گئے ہیں. لیکن بیشتر امور میں صرف اصولی ہدایات دی گئی ہیں. نظامِ خداوندی کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان اصولوں کی جزئیات، حالات کے تقاضے کے مطابق، جماعتِ مومنین کے مشورے سے خود مرتب کرے. نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو صحابہؓ سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اس کی یہی غرض تھی. چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ان اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں. مثلاً قرآنِ کریم میں زکوٰۃ کا حکم متعدد مقامات پر آیا ہے. لیکن کسی جگہ بھی اس کی شرح یا نصاب کا ذکر نہیں. یعنی یہ ایک اصولی حکم تھا جس سے مقصد یہ تھا کہ اسلامی نظام، افرادِ معاشرہ کی جسمانی پرورش اور انسانی ذات کی نشوونما کا انتظام کرے. اس انتظام کی شکل کیا ہوگی. اس کے لئے ذی استطاعت افراد سے کیا کچھ لیا جائے گا. اسے کس طرح خرچ کیا جائے گا. یہ سب جزئیات اس نظام کو مرتب کرنی تھیں. نبیٔ اکرمؐ نے جب اس کا انتظام فرمایا تو اس کے لئے ایک شرح (اڑھائی فیصد) مقرر فرمائی ہوگی. کیونکہ اس زمانے کے حالات کے مطابق اتنے ہی سے ضروریات پوری ہوگئی ہوں گی. اس سے ظاہر ہے کہ "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" سے مطلب یہ نہیں تھا کہ "زکوٰۃ دو" پر عمل کرنے سے خدا کی اطاعت ہوگئی اور اڑھائی فیصد دینے سے رسولؐ کی اطاعت ہوگئی. اُس وقت کے اسلامی نظام میں اڑھائی فیصد دے دینے سے "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" پوری ہو جاتی تھی.

اصولوں کی جزئیات

یہ نظام آگے چلا

اسلامی نظام نبیِ اکرمؐ کی ذات تک ہی محدود نہیں تھا کہ حضورؐ کی وفات سے یہ سلسلہ ختم ہو جاتا۔ اسے تو قیامت تک آگے مسلسل چلنا اور قائم رہنا تھا۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات کے بعد، یہ نظام، خلافتِ راشدہ کی شکل میں قائم ہوا۔ اب "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" سے مراد تھی خدا کے احکام کی اطاعت اُس نظام کی رُو سے جس کا مرکز خلیفۃ الرّسول تھا۔ اُس زمانے میں، انداز یہ تھا کہ قرآن کے احکام کی اطاعت اُسی طرح کرائی جاتی تھی جس طرح حضورؐ کے زمانے میں ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ احکام غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ باقی رہیں وہ جزئیات جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں، حضورؐ کے زمانے میں مرتّب ہوئی تھیں، تو ان میں سے جن میں کسی ردّ و بدل کی ضرورت نہ ہوتی، انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جاتا۔ جن میں حالات کی تبدیلی سے کسی تغیّر و تبدّل کی ضرورت ہوتی، ان میں ضرور تبدیلی کر دی جاتی۔ اور جہاں کسی نئی شق کی ضرورت پڑتی اس کا اضافہ کر دیا جاتا۔ چنانچہ اُس زمانے میں، رسول اللہؐ کی عہدِ مبارک کی متعیّن کردہ جزئیات میں جو تبدیلیاں کی گئیں یا جن نئی شقوں کا اضافہ کیا گیا ان کی تفصیل تاریخ میں موجود ہے[1]۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آجائے گی کہ قرآن کریم نے تمام احکام کی تفاصیل خود ہی کیوں نہیں دیں۔ اور یہ بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے زمانے کے جزئی احکام اور فیصلوں کو منضبط اور محفوظ شکل میں اُمّت کو کیوں نہ دیا۔ قرآن کے احکام اور اصولوں کو ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل رہنا تھا۔ اس لئے انہیں محفوظ کر دیا گیا۔ ان اصولوں کی روشنی میں جن جزئیات کو مرتّب ہونا تھا، وہ زمانے کے حالات کے مطابق قابلِ تغیّر و تبدّل تھیں اس لئے انہیں محفوظ نہیں کیا گیا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ صحابہ کبارؓ بھی اس حقیقت سے باخبر تھے اسی لئے انہوں نے بھی احادیث کو محفوظ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بلکہ اس سے سختی سے روکا۔ اس لئے کہ اگر انہیں محفوظ کر دیا جاتا تو اس کا احتمال تھا کہ بعد میں انہیں قرآن کی طرح غیر متبدّل سمجھ لیا جاتا۔

جب تک خلافت کا نظامِ خداوندی قائم رہا، یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے رہی اور "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" احادیث کے بغیر ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد قسمتی سے یہ سلسلہ قائم نہ رہا۔ خلافت، ملوکیت میں بدل گئی۔ دین اپنی حقیقی شکل میں قائم نہ رہا۔ اس میں "مذہب اور سیاست" کی ثنویت پیدا ہو گئی۔ امورِ سیاست کو سلاطین نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور مذہبی امور (عقائد، عبادات یا زیادہ سے زیادہ نکاح، طلاق سے متعلق شخصی قوانین "علماء" کے

[1] ان امور کی تفاصیل پرویز صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب — "شاہکارِ رسالت" — میں ملیں گی۔

سپرد کر دیئے گئے۔ اب "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" کا وہ تصور بھی باقی نہ رہا۔ اس لئے کہ جب حکومت کا فریضہ احکامِ خداوندی کی تنفیذ نہ رہا تو اس کی اطاعت "خدا اور رسول کی اطاعت" نہ رہی۔ اس وقت یہ سوال اٹھا کہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کیسے کی جائے۔ اگر امّت کی قسمت نیک ہوتی تو اس وقت

بعد میں کیا ہوا؟

فیصلہ یہ کیا جاتا کہ ہمیں وہ نظام پھر سے قائم کرنا چاہیئے جس میں نظامِ خداوندی کی اطاعت، "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" ہوتی تھی۔ لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ اس کے بعد اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا کہ یہ سمجھا جاتا کہ خدا کی اطاعت، قرآن کے ذریعے کی جائے اور رسولؐ کی اطاعت حضورؐ کے ارشادات کی فرماں برداری سے۔ اس سے احادیث کے جمع اور منضبط کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی[1]۔ اس کے بعد چونکہ آج تک پھر خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت کا نظام کہیں قائم نہیں ہوا۔ اس لئے "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" کا حقیقی مفہوم اور طریق بھی سامنے نہیں آیا۔ اس تمام عرصہ میں، توجہات کا مرکز حدیث ہی رہی (یا وہ فقہ جو احادیث کی روشنی میں مرتب کی جاتی رہی)۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم میں احکام بہت تھوڑے سے تھے اور زندگی کی عملی ضروریات ان سے کہیں زیادہ۔ ان ضروریات کو اُن جزئی احکام کو پورا کرنا تھا جنہیں خلافت مرتب کرتی۔ اب ان کی عدم موجودگی میں، بار بار نگاہ حدیثوں کی طرف اٹھتی تھی۔ جب عام متداول حدیثیں بھی اس مقصد کے لئے ناکافی ہوگئیں تو پھر نئی نئی حدیثیں وضع کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ انہی حدیثوں کی رُو سے مختلف فرقے وجود میں آتے گئے اور ہر فرقے نے اپنے اپنے مسلک کی تائید میں احادیث فراہم یا عندالضرورت وضع کر لیں۔ اس سلسلہ پر جب صدیاں گزر گئیں تو اس تصوّر نے ایک محکم عقیدہ بلکہ ایمان کی شکل اختیار کر لی کہ رسولؐ اللہ کی اطاعت احادیث کے ذریعے ہوتی ہے اور احادیث کو "نہ ماننے والا" منکرِ رسالت ہے۔ یہ ہے وہ غلط نگہی جو دین کے معاملہ میں تمام الجھنوں کا بنیادی سبب ہے۔ اس

اس کا حل

الجھن سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت قائم کی جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی مملکت اس امر کا فیصلہ کرے کہ اس کو قرآنِ کریم کے احکام و اصولات کے مطابق حکومت کرنی ہے۔ وہ قرآن کے احکام کو نافذ کرے۔ اس کے بعد دیکھے کہ زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق قرآن کیا اصولی راہنمائی دیتا ہے اور ہماری قانونی ضروریات کیا ہیں۔ حدیث

---

[1] نبیِ اکرمؐ اور صحابہؓ کے زمانے کی تاریخ مرتب کرنے کا خیال بھی اس کا محرک تھا۔ مقصد دونوں محرکات کا ایک ہی تھا۔ کسی نے واقعات کے قلمبند کرنے پر زیادہ زور دیا، کسی نے احکام کو جمع کرنے پر۔

(اور فقہ) کا جو سرمایہ ہمارے ہاں متوارث چلا آرہا ہے اگر اس میں ایسے قوانین مل جائیں جو قرآنی اصول کے مطابق ہوں اور ہماری ضروریات کو پورا کریں، انہیں اپنے ہاں بطور قانونِ مملکت جاری کرے۔ جہاں ایسے قوانین نہ ملیں قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے لئے جزئی قوانین خود مرتب کرے۔ یہ اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین، خواہ وہ پہلے سے مرتب شدہ ہوں یا اس مملکت کے خود مرتب کردہ، عند الضرورت بدلتے رہیں گے۔ ان قوانین کا اطلاق مملکت کے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہوگا اور اس میں کسی فرقہ کی تمیز و تفریق نہیں ہوگی۔ اسی طرح یہ مملکت شعائرِ اسلامی میں بھی وحدت پیدا کرتی جائے گی۔ اس سے رفتہ رفتہ معاشرہ کی وہی کیفیت ہو جائے گی جو عہدِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذین معہٗ میں تھی۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اسلامی نظام میں، قرآن کے احکام اور اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان قوانین پر عمل کرانے کے طریق اور ان اصولوں کی روشنی میں وضع کردہ جزئیات، زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہیں گی۔ علامہ اقبالؒ اس سلسلہ میں اپنے خطبات "تشکیلِ جدید" میں فرماتے ہیں۔

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں...... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

احادیث کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:۔

> احادیث کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم

ورواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترامیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے۔ کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم ورواج کو رسولؐ اللہ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولیؒ اللہ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات، اطوار اور رسوم ورواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا، پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات وخصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسولؐ کے احکام اُس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظمؒ ابوحنیفہ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ

اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تین سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں مَیں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

(خطباتِ اقبالؒ صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۳)

نبی اکرمؐ کے زمانے کے احکام میں تغیّر و تبدّل کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

مودودی صاحب اور جزئیاتِ دین

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیّر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیّر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حِکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں...... پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النّص اور اشارۃ النّص تو درکنار، صراحۃ النّص کی پیروی بھی تفقّہ کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ اور تفقّہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد اور مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیّرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیّر کرتا رہے جو شارع کے اصولِ تشریح پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔

(تفہیمات، شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی، لاہور
حصہ دوم، ص۳۲۷)

وہ اسی کی تفصیل میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدّن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کرکے اس تمدّنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہش مند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلفِ صالحین کی پیروی اس کا نام ہے کہ تمدّن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر (FOSSILISED) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیّرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کرکے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے ارد گرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیّر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصوّر جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلّط ہے۔ درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدّن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیّر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیّر و ارتقاء کو غلط راستوں سے روک کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیّرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، ان سب میں یہی روح بھرتے جائیں جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے کہ ہم کو "خیر امّۃ" جو بنایا گیا ہے تو یہ اس لئے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (REAR GUARD) کی حیثیت میں لگے رہیں۔ بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارے "خیر امّہ" ہونے کا راز "اخرجت للنّاس" میں پوشیدہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے اصحابؓ کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہئے یہ ہے کہ انہوں نے قوانینِ طبعی کو قوانینِ شرعی کے تحت کرکے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا

حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قالب میں روح پھونکی ــ پس نبیؐ اور اصحابؓ نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانینِ طبعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیب اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدرِ اوّل میں کی گئی تھی۔ (کتاب نشانِ راہ' شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی' دار السلام' پٹھانکوٹ' ص۵۵)

مولانا امین احسن اصلاحی کا مسلک یہ ہے کہ قرآن ہی نہیں' بلکہ احادیث میں بھی بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں اور جزئیات کا تعین امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

قرآن و حدیث کے اندر بیشتر صرف بنیادی اور اصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں۔ جزئیات و تفصیلات سے ان میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ اس خلاء کو حالات و ضروریات کے تحت بھرنا نیز تمام پیش آنے والے اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اسلام کے منشاء اور مزاج کے مطابق قوانین بنانا اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن' لاہور' اپریل ۱۹۵۴ء)

ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآنِ کریم میں جہاں "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" یا "خدا اور رسولؐ کی معصیت" کا ذکر آیا ہے اس سے مراد وہ نظامِ حکومت ہے جسے احکامِ خداوندی کے نافذ کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہو۔ دیکھئے مودودی صاحب اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ سورۃ المائدہ کی آیت ۳۳ میں کہا گیا ہے کہ إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ...... "جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ:" اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مودودی صاحب اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں لکھتے ہیں:۔

خدا اور رسولؐ سے لڑنے کا مقصد اس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔ (تفہیم القرآن' جلد اوّل' ص۴۶۵۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

لہٰذا' خدا اور رسولؐ کی اطاعت سے مراد' اپنے اپنے طور پر' قرآن اور احادیث کی اطاعت نہیں' بلکہ اس نظامِ خداوندی کی سنٹرل اتھارٹی (مرکز) کی اطاعت ہے جو احکامِ خداوندی کی تنفیذ کے لئے قائم ہو۔ یہ اس کا کام ہے کہ دیکھے کہ ان احکام کی اطاعت کس طرح کرائی جا سکتی ہے۔ اسی کا نام "اتباعِ سنت" ہے جس سے سرکشی اختیار کرنے والا محض نظری طور پر "مرتد" قرار نہیں پاتا بلکہ عملاً بغاوت کے جرم کا مرتکب ٹھہرتا ہے۔ اس نظام کی عدم موجودگی میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت' انفرادی عمل رہ جاتا ہے جس کی پابندی ہر فرد یا ہر فرقہ اپنی اپنی صوابدید کے مطابق کرتا ہے۔ اس نظام کے قیام کے بعد' خدا اور رسولؐ کی اطاعت' اس نظام کے فیصلوں کی اطاعت کی رُو سے کی جاتی

ہے۔ یہی دین کا مقصود ہے اور اسی سے اُمت میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔

سیرتِ طیّبہ

ہمارے احادیث کے مجموعوں میں ایک حصہ ایسی روایات کا بھی ہے جن کا تعلق نبیٔ اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے حالات و کوائف سے ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ اقدس، انسانی شرف و مجد کی معراج کبریٰ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ان روایات میں بعض ایسی بھی ہیں جن سے آپؐ کی سیرت داغدار ہوتی ہے۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ قرآن کریم کی روشنی میں از سرِ نَو مرتب کی جائے اور کتبِ روایات میں سے صرف وہی حصہ لیا جائے جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو۔ جو روایات قرآن کے خلاف ہوں، یا ان سے حضورؐ یا صحابہ کرامؓ کی سیرت پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہو، انہیں مسترد کر دیا جائے۔

یہ ہے حدیث کی صحیح پوزیشن۔ جب تک ہم اس پوزیشن کو قبول نہیں کریں گے اور سرمایۂ حدیث کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھیں گے، ہم ان الجھنوں سے کبھی نہیں نکل سکیں گے جن میں اُمت صدیوں سے گرفتار چلی آ رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اس حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

علمِ حدیث

(علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوریؒ)

حدیثیں یعنی وہ اقوال و اعمال و احوال وغیرہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اور بسلسلۂ روایت کتابوں میں مدون کئے گئے ہیں، ان کے متعلق ابتداء ہی میں یہ بحث شروع ہوئی کہ ان کی حیثیت دینی نہیں ہے بلکہ تاریخی ہے، جس کی بنا اس پر تھی کہ ان کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غیر یقینی ہے کیونکہ خبروں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ صبح سے شام تک میں تبدیل ہو کر کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہیں اور جتنے بڑے آدمی کی باتیں بیان کی جاتی ہیں، اتنا ہی ان میں تغیّر و تبدّل کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں سب سے بڑے آدمی تھے. چنانچہ پہلی ہی صدی ہجری سے امت میں ایسے طبقات پیدا ہو گئے جو اپنے اغراض کے لئے حدیثیں بنا کر حضورؐ کی طرف منسوب کرنے لگے. وضاعین و کذابین کے تراجم اور موضوع روایات جن کے بیسیوں مجموعے موجود ہیں، اس پر شاہد ہیں اور آج حدیث کی جس قدر کتابیں امت کے ہاتھوں میں ہیں، اس پر شاہد ہیں کہ ان میں سے کوئی عہدِ رسالتؐ یا زمانۂ صحابہؓ کی لکھی ہوئی نہیں ہے. بلکہ ایک موطا امام مالکؒ کے سوا جو دوسری صدی ہجری کی تالیف ہے، بقیہ جملہ کتبِ حدیث جن میں صحاح ستہ بھی شامل ہیں، تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد مرتب کی ہوئی ہیں.

محدثین نے روایات کو دینی تسلیم کر لیا اور ان کے اثر سے تمام اُمت میں ان کی دینی حیثیت مسلّم ہو گئی. مگر محققین کی ایک جماعت ہمیشہ سے قرآن ہی کو مکمل دین مانتی اور حدیثوں کو تاریخ دین سمجھتی رہی ہے، اس لئے میں نے چاہا کہ تاریخِ حدیث کے ان ابواب کو روشنی میں لاؤں جن سے اس کی حقیقت واضح ہوتی ہے تاکہ اس کا صحیح رتبہ معلوم ہو سکے.

روایاتِ حدیث

روایات کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے ہی میں ہو چکا تھا صحابہ کرامؓ جن اوقات میں صحبتِ مبارکہ میں موجود نہیں رہتے تھے، ان اوقات کے احوال و اقوالِ نبویؐ کو دوسرے صحابہؓ سے جو حاضر رہتے تھے، پوچھتے اور سنتے تھے۔ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ میں اور میرے ایک انصاری پڑوسیؓ باری باری سے ایک ایک دن رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ پھر ہم ایک دوسرے کو اپنے اپنے دن کے وہ حالات جو وہاں گزرتے تھے، سنا دیتے تھے[1][2] لیکن یہ حضرات کرام سنتے اسی سے تھے، جس پر ان کو خود اعتماد ہوتا تھا، کیونکہ اس عہد میں منافقین بھی تھے۔ جو طرح طرح کی غلط باتیں حضورؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق بیان کیا کرتے تھے اور وہ مسلمانوں میں ملے جُلے رہتے تھے کہ ان کا امتیاز کرنا مشکل تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ (۹/۱۰۱)

مدینہ والوں میں سے کچھ لوگ نفاق پر اڑے ہوئے ہیں تم ان کو جانتے نہیں ہو ہم ان کو جانتے ہیں۔

علاوہ بریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تاکید تھی کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے سے بچو[3] اس لئے عہدِ رسالتؐ میں روایتیں بہت تھوڑی تھیں اور وہ بھی اخباری حیثیت رکھتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد صحابہؓ چونکہ اپنی محبوب ترین شخصیت سے محروم ہو گئے تھے۔ اس لئے فرصت کے اوقات میں دو چار جب مل کر بیٹھتے تو آپؐ کے زمانے کے تذکرے درمیان میں لا کر آپؐ کی یاد تازہ کرتے مگر ان بیانات میں اختلاف ہونے لگا، اس وجہ سے خلیفہ اوّل حضرت ابو بکرؓ نے روایت کی یک قلم ممانعت کر دی اور لوگوں کو جمع کر کے فرمایا:۔

> تم جب آج اختلافات کرتے ہو تو آئندہ نسلیں اور بھی اختلافات کریں گی۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کوئی روایت نہ کرو۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہے۔ جو اس نے جائز کیا ہے اس کو جائز اور جو اس نے ناجائز کیا ہے اس کو ناجائز سمجھو[4]

مگر باوجود اس ممانعت کے، روایت کا سلسلہ جاری رہا، کیونکہ اس کو جرم قرار نہیں دیا گیا تھا۔

---

[1] ان کی سکونت مسجدِ نبوی سے فاصلہ پر محلہ بنی امیہ بن زید میں تھی [2] صحیح بخاری [3] ابن ماجہ ص ۵ [4] تذکرۃ الحفاظ ذہبی۔

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ بھی اپنے زمانے میں روایت کو روکتے تھے۔ قرظہ بن کعبؓ کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت کے ساتھ عراق کو روانہ ہوئے۔ حضرت عمرؓ مقامِ صرار تک ہم کو رخصت کرنے کے لئے ساتھ آئے، وہاں پہنچ کر فرمایا۔ "تم جانتے ہو کہ میں کیوں یہاں آیا ہوں!" ہم نے کہا کہ ہماری مشایعت اور تکریم کی غرض سے۔ فرمایا کہ ہاں! اور اس لئے بھی کہ تم سے کہوں کہ تم وہاں جارہے ہو، جہاں لوگوں کی تلاوتِ قرآن کی آواز شہد کی مکھیوں کی آواز کی طرح گونجتی رہتی ہے۔ لہٰذا ان کو حدیثوں میں پھنسا کر قرآن سے نہ روکنا۔ اور روایتیں نہ سنانا۔ قرظہ کہتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے پھر کبھی میں نے حدیث نہیں بیان کی۔[1]

فاروقِ اعظمؓ روایت کے معاملے میں اس قدر سخت تھے کہ ابی بن کعب کو جب حدیثیں سناتے دیکھا تو دُرّہ لے کر ان کو مارنے کے لئے تیار ہو گئے۔[2] ایک بار ابوسلمہؓ نے حضرت ابوہریرہؓ سے جو کثرتِ روایت میں مشہور ہیں، پوچھا کہ کیا تم اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر ان کے زمانہ میں بیان کرتا تو مجھے پیٹ ڈالتے۔[3]

حضرت عمرؓ اس امر میں صحابہ کبارؓ کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ابوالدرداءؓ اور ابوذر رضی اللہ عنہم کو ڈانٹا کہ تم یہ کیا روایتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بیان کرتے رہتے ہو؟ پھر ان کو مدینہ میں نظر بند رکھا اور جب تک زندہ رہے کہیں جانے کی اجازت نہیں دی۔

خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کو روایت کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی اور وہ اس کو مسترد کر دیا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت علیؓ کے بیٹے محمد اپنے والد سے ایک پرچہ لے کر جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا حکم، زکوٰۃ کے متعلق لکھا ہوا تھا، ان کے پاس گئے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے معاف رکھو۔[4]

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کثرتِ روایت سے منع فرماتے۔ خود ان کے سامنے جب کوئی حدیث بیان کرتا تو اس سے حلف لیتے۔[5] اکثر تاکید کیا کرتے کہ جن حدیثوں کو لوگ نہیں جانتے ان کو نہ بیان کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ لوگ اللہ و

---

[1] مختصر جامع بیان العلم، مصنف حافظ ابن عبدالبر، مطبوعہ قاہرہ، ص ۱۷۵۔

[2] تذکرۃ الحفاظ، مصنف امام ذہبی، جلد ۱ ص ۷۔

[3] توجیہ النظر الی اصول الاثر للشیخ طاہر بن صالح الجزائری، ص ۱۱ تا ۱۸۔ مطبوعہ قاہرہ

[4-5] " " " " " ص ۱۱ تا ۲۰۔ مطبوعہ قاہرہ۔

رسولؐ کی تکذیب کرنے لگیں[1]؟

خلفائے راشدین ہی کی طرح بالعموم صحابہ کرامؓ بھی روایت کے معاملہ میں سخت محتاط تھے بلکہ بعض حضرات اس سے بالکلیہ اجتناب کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت زبیرؓ سے ان کے بیٹے حضرت عبداللہؓ نے کہا کہ جس طرح دوسرے اصحاب حدیثیں بیان کرتے ہیں، میں نے آپ کو بیان کرتے نہیں سنا۔ فرمایا کہ میں نے کبھی آنحضرتؐ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر میں نے آپ کو یہ کہتے سُنا ہے کہ من کذب علیَّ فلیتبوأ مقعدہ من النار جو میرے اوپر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ پھر حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں نے اس میں متعمداً یعنی قصداً کا لفظ بڑھالیا ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ میں نے یہ لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے نہیں سُنا[2]۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ توسیع روایت کے لئے لوگوں نے کرلیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف کوئی غلط بات منسوب کرنا خواہ قصداً ہو یا بلا قصد جہنّم مول لینا ہے۔ حضرت انسؓ سے بھی مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہی فرمان مجھ کو حدیث بیان کرنے سے روکتا ہے۔

سنن ابنِ ماجہ میں ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے حضرت زید بن ارقمؓ سے درخواست کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی کوئی حدیث سنایئے۔ فرمایا کہ ہم بوڑھے ہوگئے اور بھول گئے اور آنحضرتؐ کی حدیث بیان کرنے کا معاملہ بھی بہت سخت ہے۔ سائب بن یزید کا بیان ہے کہ میں حضرت سعد بن مالک کے ساتھ مدینہ تک گیا۔ مگر ان کو کوئی حدیث بیان کرتے نہیں سنا۔ اسی طرح امام شعبی کا قول ہے کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں سال تک رہا اور کوئی حدیث ان کی زبان سے نہیں سنی[3]۔ یہی نہیں کہ صحابہؓ خود حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے بلکہ دوسروں سے جو حدیثیں سنتے تھے، ان کو قبول کرنے میں بھی تامّل فرماتے تھے۔ چنانچہ اکثر صحابہؓ سے بہت سی روایتوں کے قبول کرنے میں توقف کرنا ثابت ہے۔ جس سے ان لوگوں نے سند پکڑی ہے جو حدیثوں کو دینی حجّت نہیں مانتے[4]۔

---

[1] توجیہہ النظر الیٰ اصول الاثر للشیخ طاہر بن صالح الجزائری ص ۱۱ تا ۱۸

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

[3] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

[4] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کو کہ آگ کی چھوئی ہوئی چیز سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ اس بنیاد پر تو آگ پر گرم کئے ہوئے پانی سے وضو ہی نہیں ہو سکتا۔ حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ نے بھی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کھیتی کے کتے کے متعلق سنی تو فرمایا کہ ہاں ابوہریرہؓ کے پاس کھیتی ہے۔

حضرت محمود انصاریؓ نے، جو صحابی تھے، جب یہ حدیث بیان کی کہ جس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہہ دیا جہنم اس پر حرام ہوگیا تو حضرت ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ واللہ! میں نہیں سمجھتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی ایسا کہا ہو[۱]۔

بعض روایات کو صحابہؓ نے قرآن کے خلاف دیکھ کر ان کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مثلاً فاطمہ بنت قیس کی روایت کہ طلاق بائنہ پائی عورت کے لئے شوہر کے ذمے نہ مکان ہے نہ نفقہ۔ حضرت عمرؓ نے قبول نہیں کیا اور کہا کہ قرآن کے خلاف ایک عورت کی بات کیسے مان لوں جس نے معلوم نہیں کہ صحیح یاد بھی رکھا ہے یا نہیں؟

حضرت ابنِ عمرؓ نے قلیبِ بدر والی روایت جب بیان کی کہ مُردے سنتے ہیں تو اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ ابنِ عمرؓ پر رحم کرے۔ قرآن میں تو ہے۔ "اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ"۔

اسی طرح جب امّ المومنینؓ موصوفہ کے سامنے یہ روایت پیش کی گئی کہ مُردہ پر اس کے گھر والوں کے نوحہ کرنے سے عذاب ہوتا ہے تو کہا یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن میں ہے کہ ایک کا گناہ دوسرا نہیں اٹھائے گا۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔

اس قسم کی روایات سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ صحابہ حدیث کو حتمی حجت نہیں سمجھتے تھے اور کبھی قرآن اور کبھی قیاس کے خلاف دیکھ کر اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔

وجوہاتِ مذکورہ کے باعث عہدِ صحابہ میں روایات کا ذخیرہ نہایت قلیل تھا۔ علاوہ بریں وہ عملی زندگی میں منہمک تھے۔ اور اعلائے کلمۃ الحق و حروب و فتوحات کی مشغولیت سے ان کے لئے یہ موقعہ بھی کم تھا کہ بیٹھ کر روایتیں کرتے۔ اس لئے یہ بالکل قرینِ قیاس ہے کہ ان کے ناموں سے جو بے شمار روایتیں منسوب کی گئی ہیں وہ زمانہ مابعد کے رواۃ کا کارنامہ ہیں جب کہ حدیثوں نے فن کی صورت اختیار کر لی اور ہر روایت کے سلسلہ سند کی ضرورت پڑی جو

---

[۱] صحیح بخاری باب صلوٰۃ النوافل جماعت۔

بلا کسی صحابی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم تک منتہی نہیں ہو سکتا تھا۔

جماعتِ صحابہؓ میں سب سے زیادہ جس کے نام سے روایتیں بیان کی گئی ہیں وہ حضرت ابو ہریرہؓ ہیں۔ ابنِ مخلد کا بیان ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے۔ حالانکہ وہ عامِ خیبر میں اسلام لائے اور صرف تین سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حضوری میں شرف یابی کا موقع پایا۔ پھر یہ کیونکر یقین کیا جائے کہ ان کی روایتیں اس قدر ہو سکتی ہیں جن میں سے بہت سی ایسی ہیں کہ ان کے اوپر عقل و علم کی رُو سے گرفت کی گئی ہے اور کی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہمارا ضمیر قبول نہیں کر سکتا کہ اس قسم کی روایتیں انہوں نے بیان کی ہوں گی۔

عہدِ صحابہؓ کے بعد تابعینؒ کا زمانہ آتا ہے جس میں خلفائے بنی اُمیہ کا استبداد اُمت پر مسلّط ہو چکا تھا۔ اور بجائے اس کے کہ خلافتِ راشدہ میں ہر مسلم خود مختار، آزاد اور صرف اکیلے اللہ کا بندہ ہوتا، اب شخصی حکومت کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا اور تمام امت جبراً و قہراً رعایا بنائی گئی تھی، اس لئے ذہنیتوں میں نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی، اور صلاح و تقوے کی بھی وہ کیفیت باقی نہیں تھی جو صحابہ کرامؓ کے عہد میں تھی۔ سلطنت اور مذہب میں تفریق ہو جانے کے باعث دینی قیادت علماء کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ اس وجہ سے روایت کا سلسلہ بہ نسبت سابق کے بڑھ گیا تھا، پھر بھی ان شاگردانِ صحابہ میں بہت کچھ صداقت موجود تھی اور وہ روایتوں کے بیان نیز ان کے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں جب حدیث کی تدوین شروع ہوئی۔ اس نے فن کی صورت اختیار کر لی اور طالبانِ حدیث ان ائمہ کے پاس جو اس میں شہرت رکھتے تھے اس کی تحصیل کے لئے جمع ہونے لگے، اور یہ سلسلہ بڑھنے لگا۔ عہدِ عباسیہ میں جو ۱۳۲ھ سے شروع ہوا، حدیثوں کی روایت سیلاب کی طرح بڑھ گئی اور جملہ اسلامی ممالک میں کثرت کے ساتھ اس کا چرچا پھیل گیا، کیونکہ خلفاء امراء کی دنیاداری اور دین سے بے پروائی کی وجہ سے طالبانِ دین تمام تر علمائے حدیث کے گرد سمٹ گئے جس سے ان کی عظمت و شان قائم ہو گئی۔ یہ دیکھ کر ہزاروں دنیادی جاہ و شہرت کے طالبوں نے بھی حدیث کا پیشہ اختیار کر لیا اور سچی اور جھوٹی ہر قسم کی روایتیں بیان کر کے عوام پر اپنی بزرگی کا سکّہ جمانے لگے، یہاں تک کہ حدیثوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد سات لاکھ سے

---

[1] توجیہہ النظر، ص ۱۱۔

اوپر ہے[1]۔ امام یحییٰ بن معینؒ جو حدیث کے امیر المومنین بولے جاتے ہیں، بارہ لاکھ حدیثوں کے مالک تھے[2]۔ مقدمہ صحیح بخاری میں ہے کہ امام بخاریؒ نے جب اپنی صحیح لکھنی شروع کی تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے پاس تھیں، ۲۷۵ء حدیثوں کو اپنے شروط کے مطابق پایا جن کو درج کیا۔

لیکن خود انہیں ائمہ حدیث میں سے جن کا مشغلہ دن رات روایت تھا، ایسے لوگ نکلے جن کی طبیعتیں اس سے بیزار ہوگئیں اور وہ اس کو تقوے کے خلاف سمجھنے لگے۔ حافظ ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ کی کتاب مختصر جامع بیان العلم وفضل سے اقتباس کرکے چند ائمہ کے اقوال لکھتا ہوں۔

> ضحاک ابن مزاحم متوفی ۱۰۵ھ نے فرمایا کہ زمانہ آنے والا ہے جبکہ قرآن لٹکا دیا جائے گا۔ اس کے اوپر مکڑیاں جالے تنیں گی۔ کوئی کام اس سے نہیں لیا جائے گا اور لوگوں کا عمل حدیث و روایت پر ہوگا۔ سلیمان بن حیان ازدی متوفی ۱۹۶ھ نے بھی جن کی کنیت ابوخالد الاحمر ہے، کہا کہ زمانہ زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ مصاحف کو بیکار چھوڑ دیں گے اور صرف حدیث و فقہ ان کا مشغلہ ہوگا۔
>
> امام داؤد طائی نے روایت ترک کردی تھی، ان سے کہا گیا کہ کب تک آپ حدیث کی تعلیم چھوڑ کر گھر میں بیٹھے رہیں گے۔ جواب دیا کہ میں پسند نہیں کرتا کہ ایسے راستے میں ایک قدم بھی رکھوں جو حق کے خلاف ہے۔
>
> حضرت فضیل بن عیاضؒ عابد الحرمین متوفی ۱۸۷ھ کے پاس ایک جماعت طالبانِ حدیث کی پہنچی۔ انہوں نے ان کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی اور کھڑکی سے ان کی طرف سر نکالا۔ لوگوں نے سلام کیا اور کیفیت پوچھی۔ فرمایا کہ میں اللہ کی طرف سے تو عافیت میں ہوں مگر تمہاری طرف سے مصیبت میں۔ جس شغل میں تم ہو، یہ اسلام میں نئی بدعت پیدا ہوئی ـــ "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"۔ تم نے اللہ کی کتاب کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس کو حاصل کرتے تو تمہارے دلوں کو شفا نصیب ہوتی۔ لوگوں نے کہا کہ اسے تو ہم پڑھ چکے ہیں۔ فرمایا کہ وہ ایسی کتاب ہے جو تمہاری اور تمہاری اولاد کی مشغولیت کے لئے بھی کافی ہے پھر یہ آیت پڑھی۔

---

[1] توجیہ النظر الی اصول الاثر للشیخ طاہر بن صالح الجزائری۔

[2] تہذیب الاسماء واللغات، جلد ا، ص ۱۵۷۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَ هُدًى وَ رَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا ۗ هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ۝ (۱۰/۵۷-۵۸)

لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی شفا اور مومنوں کے لئے رحمت اور ہدایت آچکی۔ کہہ دے کہ اللہ کی مہربانی اور اس کی رحمت پر تم خوشی مناؤ، یہ اس سے بہتر ہے جس کو تم جمع کر رہے ہو۔

امام سفیان ثوریؒ متوفی ۱۶۱ھ افسوس کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ اس علم میں کیا خوبی ہے جس میں ساٹھ سال گزارنے کے بعد اب یہی آرزو ہے کہ کاش برابر سرابر نکل جاتے، نہ عذاب پلتے نہ ثواب۔ ایک بار فرمایا کہ حدیث اگر اچھی چیز ہوتی تو روز بروز بڑھتی نہ جاتی۔

امام شعبہؒ نے کہا کہ پہلے جب میں کسی محدث کو دیکھتا تھا تو خوش ہوتا تھا مگر اب کوئی شے میرے نزدیک اس سے زیادہ مکروہ نہیں ہے کہ میں ان میں سے کسی کا چہرہ دیکھوں۔ ایک بار انہوں نے روایانِ حدیث کی ایک جماعت کو مخاطب کرکے فرمایا:

إِنَّ هٰذَا الْحَدِيثَ يَصُدُّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ [1] امام سفیان بن عیینہؒ متوفی ۱۹۸ھ کہا کرتے تھے کہ کاش یہ علم (حدیث) میرے سر پر شیشیوں کا ٹوکرا ہوتا اور گر کر چور چور ہو جاتا کہ اس کے خریداروں سے تو نجات مل جاتی۔ ایک بار فرمایا کہ جو مجھ سے دشمنی رکھے اللہ اس کو محدث بنا دے۔ ایک دن اصحابِ حدیث کی ایک جماعت سے کہا کہ اگر ہم کو اور تم کو حضرت عمرؓ دیکھ پاتے تو دُرّے سے خبر لیتے۔ امام شعبہؒ کی طرح یہ بھی محدثوں کی صورت سے بیزار تھے۔ طالبانِ حدیث کے ہجوم سے بھاگ کر اپنے گاؤں میل اخضر میں رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ حدیث اگر خیر ہوتی تو روز بروز کم ہوتی، بڑھتی نہ جاتی۔

---

[1] یہ حدیث تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے کیا تم باز آجاؤ گے؟ اس میں لطف یہ ہے کہ ان ھٰذا الحدیث کو چھوڑ کر بقیہ جملہ قرآن کی آیت ہے۔

اس عہد کے مشہور شاعر بکر بن حماد نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

۱۔ لقد جفت الاقلام بالخلق کلھم فمنھم شقی خائب و عنید
۲۔ تمر اللیالی بالنفوس سریعۃ و یبدئ ربی خلقہ و یعید
۳۔ اری الخیر فی الدنیا یقل کثیر و ینقص نقصا والحدیث یزید
۴۔ فلو کان خیرا قلّ کالخیر کلّہ واحسب ان الخیر منہ بعید

(۱) یعنی ساری مخلوقات کی تقدیر لکھ کر قلم خشک ہوچکا۔ اب کوئی ان میں سے بدبخت نامراد ہے، کوئی بدنصیب۔

(۲) زمانہ لوگوں پر تیزی سے گزر رہا ہے اور اللہ مخلوق کو یکے بعد دیگرے پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

(۳) میں دیکھتا ہوں کہ اچھی چیزیں دنیا میں کم ہوتی اور گھٹتی جا رہی ہیں۔ لیکن حدیث ہے کہ برابر بڑھتی جاتی ہے۔

(۴) اگر یہ بھی اچھی چیز ہوتی تو دوسری اچھی چیزوں کی طرح گھٹتی۔ میرا خیال ہے کہ خیر اس سے بعید ہے۔

یہ اقوال ان اہلِ بصیرت ائمۂ حدیث کے ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے کمال اور جامعیت کو دیکھ لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ حدیث کی حیثیت دینی نہیں ہے۔ مگر عام محدثین کے نفوس وطبائع پر حدیث کا دینی حیثیت سے اس قدر غلبہ ہوچکا تھا کہ ان کا انحراف اس سے مشکل تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان اماموں کے اقوال کے اثر کو مٹانے کے لئے روایت کی فضیلت اور اس کے ثواب کی حدیثیں پھیلائیں۔ نیز ان بزرگوں کی مخالفت بلکہ اہانت کے لئے اس قسم کی روایتیں وضع کیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب ایسا ہوگا کہ تم میں کوئی پیٹ بھرا شخص اپنے پلنگ پر تکیہ لگائے میری حدیثیں سن کر یہ کہے گا کہ ہمارے تمہارے درمیان قرآن ہے۔ اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال اور حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو۔ یاد رکھو کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اس کی مثل اور بھی بلکہ زیادہ[1]۔" حالانکہ صدیق اکبرؓ نے جیسا کہ ہم نقل کرچکے ہیں، روایت سے منع کرتے وقت یہی فرمایا تھا کہ اگر کوئی سوال کرے تو اس سے کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہے۔ جو اس نے جائز کیا ہے اس کو جائز اور جو ناجائز

[1] مشکوٰۃ المصابیح، ص۱۵۔

کیا ہے اس کو ناجائز سمجھو۔ نیز فاروقِ اعظمؓ فرمایا کرتے تھے کہ "حَسْبُنَا کِتَابُ اللهِ" ہمارے واسطے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ اُن کے خلاف یہ روایت قرآنِ کریم کو ناکافی اور غیر مکمل بتاتی ہے جو اس کے جعلی ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

اسی قسم کی باہم متعارض روایات کو دیکھ کر جو ہر باب اور ہر شعبہ میں ہیں، معتزلہ نے محدّثین پر سخت حملے کئے کہ تم نے مکذوب روایات سے دین فاسد کر ڈالا، اور علماء میں اختلاف پیدا کیا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی مخالفت بلکہ تکفیر کرنے لگے، یہاں تک کہ اُمت فرقوں میں بٹ گئی۔ امام ابنِ قیتبہؒ نے کتاب مختلف الحدیث لکھ کر ان اعتراضات کے جوابات دینے کی کوشش کی، لیکن اس میں سوائے محدّثانہ تاویلات و توجیہات کے اور کیا ہے؟

الغرض ان ائمہ کے باعث قصرِ حدیث میں جو زلزلہ آگیا تھا، اس کا روک دینا محدّثین کے لئے کچھ زیادہ دشوار نہ تھا۔ آخر کار حدیث کا غلبہ یہاں تک پہنچ گیا کہ قرآنِ کریم سے بھی اس کی اہمیت بڑھا دی گئی۔ امام اوزاعیؒ نے کہا کہ قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے، جس قدر کہ حدیثیں قرآن کی۔ امام یحییٰ بن کثیر کا قول ہے کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے۔ یہ بات جب امام احمد بن حنبلؒ سے کہی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ میں اتنی جسارت تو نہیں کر سکتا، ہاں یہ کہتا ہوں کہ حدیثیں قرآن کی مفسر ہیں۔[1]

کتابتِ حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف اعلان فرما دیا تھا کہ:۔
"مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے کچھ لکھ لیا ہو تو اس کو مٹا دے۔"

یہ روایت صحیح مسلم میں ہے۔ اس وجہ سے محدّثین اس کو موضوع تو نہیں کہہ سکے مگر چونکہ اس سے ان کی ساری بنیاد منہدم ہوتی جاتی تھی، اس لئے اس کی توجیہہ یہ کی کہ مقصد اس ممانعت سے یہ تھا کہ قرآنِ مجید کے ساتھ کوئی دوسری چیز مخلوط نہ ہو جائے۔ لہٰذا جب التباس کا خوف نہ ہو تو کتابت جائز ہے۔ اس طرح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منع کتابتِ حدیث کے واضح اور صریح حکم کو مٹا دیا گیا۔ حالانکہ آپؐ نے اس کی کوئی علت بیان نہیں فرمائی تھی اور بلا کسی قید کے مطلقاً ممانعت کی تھی۔ اگر حضورِ اکرمؐ کا یہ مقصد ہوتا کہ قرآن و حدیث مخلوط نہ ہو پائیں، تو فرما سکتے تھے کہ دونوں کو الگ الگ لکھو۔ اس لئے محدّثین کی یہ توجیہہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اصل وجہ اس کی وہ ہے جو

[1] مختصر جامع بیان العلم، مصنف حافظ ابن عبدالبر مطبوعہ قاہرہ۔ ص ۲۲۳۔

صحابۂ کرامؓ نے سمجھی۔ یعنی یہ کہ گزشتہ قومیں اپنے انبیاء کی روایات لکھنے کی بدولت گمراہ ہوئیں۔

انبیائے کرامؑ اور خاص کر سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا لکھنا عقل و علم کی رُو سے نہایت پسندیدہ اور مفید کام ہو سکتا تھا۔ مگر یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ ایسی عظیم الشان ہستیوں کے اقوال جمع و مدوّن کرنے کے بعد قومیں ان ہی کو اصل دین قرار دے لیتی ہیں اور کتابِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیتی ہیں۔ یہی راز تھا جس کی بنا پر حضورؐ نے کتابتِ روایت سے منع فرمایا تھا۔

محدّثین نے جوازِ کتابت کے لئے بعض روایتوں سے بھی استدلال کی کوشش کی ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ میں جو کچھ آنحضرتؐ سے سُنا کرتا تھا، لکھ لیا کرتا تھا۔ نیز عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے متعلق بھی ان کا بیان ہے کہ وہ لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ یمن کے ایک شخص ابو شاہ نے لکھوانے کی درخواست کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوا دیا۔ مگر یہ چیزیں مستثنیات میں شمار ہوں گی۔ عام حکم یہی تھا کہ قرآن کے سوا کچھ نہ لکھا جائے اور صحابۂ کرامؓ نے اسی کے مطابق عمل کیا۔ چنانچہ ابوداؤد، کتاب العلم میں ہے کہ ایک بار حضرت زید بن ثابتؓ کاتبِ وحی امیر معاویہؓ کے پاس گئے۔ امیر موصوف نے ان سے ایک حدیث پوچھی۔ جب حضرت زیدؓ نے بیان کیا تو انہوں نے ایک شخص کو لکھنے کا حکم دیا۔ حضرت زیدؓ نے اس کو لے کر مٹا دیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ آپؐ کی حدیثیں نہ لکھی جائیں۔

تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک مجموعہ تقریباً پانچ سو حدیثوں کا لکھ رکھا تھا۔ ایک رات اس کے متعلق نہایت متردّد اور مضطرب تھے۔ آخر صبح کو اس کو لے کر آگ میں جلا دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے صحیح مجموعہ اور کون سا ہو سکتا تھا۔ مگر صدیقِ اکبرؓ نے اس کا رکھنا بھی تقوٰے کے منافی خیال کیا کہ شاید کوئی غلط روایت اس میں شامل ہو گئی ہو۔

عروہ بن زبیرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار خواہش کی کہ سنن (اسوۂ رسولؐ) کو لکھوالیں۔ صحابہؓ سے بھی مشورہ لیا۔ انہوں نے رائے دی، پھر وہ ایک مہینہ تک اللہ سے دُعا اور استخارہ کرتے رہے بالآخر اس ارادہ سے باز رہے اور کہا کہ پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی حدیثیں لکھیں اور انہی پر جُھک پڑیں، اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا[1]۔

---

[1] مختصر جامع بیان العلم، مصنف حافظ ابن عبد البر، مطبوعہ قاہرہ، ص ۳۳۔

فاروقِ اعظمؓ جس طرح روایتِ حدیث کو روکنے میں سخت تھے، اسی طرح کتابتِ حدیث میں بھی. ان کے عہد میں جب حدیثیں زیادہ ہوگئیں تو اعلان کردیا کہ لوگ حدیثیں ان کے پاس لائیں. پھر انہوں نے ان سب حدیثوں کو لے کر جلا دیا اور فرمایا کہ اہلِ کتاب کی مثناۃ بنانی چاہتے ہو؟[1] (یہود نے اپنے انبیاء کی روایتیں جمع کر کے اس کا نام مثناۃ رکھا ہے)۔

دیگر صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل مختصر جامع بیان العلم صـ۳۲ سے اقتباس کر کے لکھتا ہوں.

عبداللہ بن یسار کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ میں ہر اس شخص کو جس کے پاس حدیث لکھی ہوئی ہو، عہد دلاتا ہوں کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد اس کو مٹا ڈالے' کیونکہ گذشتہ اقوام اسی وجہ سے تباہ ہوئیں کہ انہوں نے اپنے علماء کی روایات کی پیروی کی اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

ابو نضرہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے پوچھا کہ جو حدیثیں ہم آپ کی زبان سے سنتے ہیں، لکھ لیا کریں؟ فرمایا کہ تم ان کو مصحف بنانا چاہتے ہو؟

حضرت زید بن ثابتؓ کو خلیفہ مروان نے بلایا. وہاں انہوں نے کچھ لوگوں کو حدیثیں لکھتے ہوئے دیکھا. اُن سے فرمایا کہ ممکن ہے کہ روایت جس طرح تم سے بیان کی گئی ہے، اس طرح نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک نوشتہ لایا گیا جس میں حدیثیں تھیں. انہوں نے اس کو جلا دیا اور کہا کہ میں اللہ کا واسطہ دلاتا ہوں کہ جس شخص کو کسی کے پاس روایت کی کسی تحریر کی موجودگی کا علم ہو، وہ ضرور آ کر مجھ کو بتا دے تاکہ میں وہاں پہنچوں. تم سے پہلے اہلِ کتاب اسی باعث ہلاک ہو چکے ہیں کہ انہوں نے اس قسم کے نوشتوں کے پیچھے اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

حضرت عبداللہؓ بن عباس بھی کتابتِ حدیث سے منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ گذشتہ قوموں کی ہلاکت اسی وجہ سے ہوئی۔ یہی حال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا تھا۔

---

[1] طبقات ابنِ سعد جز خامس، ص ۱۴۰۔

عہدِ صحابہؓ کے بعد ائمہ تابعین بھی مثلاً علقمہ، مسروق، قاسم شعبی، منصور، مغیرہ اور اعمش وغیرہ کتابتِ حدیث کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

امام اوزاعی کہا کرتے تھے کہ "حدیثوں کا علم جب تک زبانی تھا شریف علم تھا۔ مگر جب سے لکھا جانے لگا، اس کا نور جاتا رہا اور نا اہلوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا"[1] یہی وجہ تھی کہ تابعین کبار کے عہد تک حدیثیں غیر مدوّن تھیں اور سوائے قرآن مجید کے امت کے ہاتھوں میں دوسری کتاب نہ تھی۔ بعض چیزیں محض علمی لحاظ سے لکھ لی گئی تھیں۔ مثلاً حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے عہدِ خلافت میں جو صفر ۹۹ھ سے رجب ۱۰۱ھ تک تھا۔ سعید بن ابراہیم سے حدیثیں لکھوائیں اور مدینہ کے قاضی ابو بکر بن حزم کو فرمان بھیجا کہ عمرہ کی روایتیں لکھ لی جائیں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ ان کی وفات سے ان کا علم ضائع ہو جائے گا۔ یہ عمرہ حضرت عائشہؓ اُمّ المؤمنین کی روایات کا علم رکھتی تھیں۔

حدیث کے مدوّنِ اوّل محدّثین کے نزدیک امام ابنِ شہاب زہری متوفی ۱۲۴ھ تسلیم کئے گئے ہیں۔ یہ خلفائے بنی اُمیہ کے درباروں میں بہت معزّز تھے اور ان ہی کے حکم سے انہوں نے حدیثیں لکھیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ہم کو حدیثوں کا لکھنا گوارا نہ تھا۔ لیکن ان خلفاء نے مجبور کر کے لکھوایا۔[2]

امام زہریؒ کے بعد جریح نے مکّہ میں، محمد بن اسحٰق اور مالک بن انسؒ نے مدینہ میں، ربیع بن صبیح اور حماد بن سلمہ نے بصرہ میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں، اوزاعی نے شام میں، معمر نے یمن میں، ہیثم نے واسط میں، جریر نے رَے میں، اور ابن المبارک نے خراسان میں، جو سب کے سب ایک ہی زمانہ میں تھے، حدیث کی کتابیں مدوّن کیں۔

یہ جملہ حضرات دوسری صدی ہجری کے ہیں۔ لیکن ان کی کتابوں میں سے جہاں تک علم ہے سوائے موطا امام مالک متوفی ۱۷۹ھ کے اور کوئی کتاب امت کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ اس کے بھی مختلف نسخوں میں صرف تین سو سے پانچ سو تک حدیثیں ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ امام مالک جب تک زندہ تھے ہر سال اس میں سے کچھ حدیثیں ساقط کر دیتے تھے۔[3] یہی وجہ ہے کہ اس کے مختلف نسخوں میں روایات کی تعداد مختلف نظر آتی ہے۔

---

[1] توجیہ النظر، ص ۷۔ [2] مختصر جامع بیان العلم، ص ۳۸۔ [3] توجیہ النظر، ص ۱۰۔

ان ابتدائی تالیفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں، صحابہؓ کے اقوال اور تابعینؒ کے فتادے سب ملے جُلے تھے۔ بعد کے لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو الگ مدوّن کرنا شروع کیا۔ اس قسم کی تالیفیں مسند کہی جاتی ہیں۔ سب سے پہلی مسند عبداللہ بن موسےٰ نے تیسری صدی ہجری کے آغاز میں لکھی۔ پھر مسدود بصری، اسد بن موسیٰ اور نعیم بن حماد وغیرہ نے۔ ان کے بعد کے طبقہ نے بھی ان کی پیروی کی۔ مثلاً امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ وغیرہ۔ چوتھے طبقہ میں امام بخاریؒ متوفی ۲۵۶ھ نے صرف صحیح حدیثوں کے مدوّن کرنے کی کوشش کی۔ ان کے بعد ان کے شاگرد امام مسلمؒ نیشاپوری متوفی ۲۶۱ھ نے بھی ان ہی کی پیروی کی۔ یہ دونوں کتابیں صحیحین کہی جاتی ہیں۔ اس زمانہ سے کتابتِ حدیث محدثین کا ایک عام مشغلہ ہوگیا اور مختلف نوعیتوں سے اس کی اس قدر کتابیں لکھی گئیں جن کا شمار مشکل ہے۔

یہاں غور کے قابل یہ امر ہے کہ حدیثوں کی اگر دینی حیثیت ہوتی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس شدت کے ساتھ اس کی کتابت کو نہ روکتے، اس کے خلاف اس کی حفاظت کی کوشش کرتے۔

وضعِ حدیث

ہرچند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید کے ساتھ فرمایا تھا کہ "جو میرے اوپر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔" اور یہ قول اتنے صحابہؓ سے مروی ہے کہ بعض محدثین نے اس کے متواتر ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے ایسے لوگ تھے جو اسی زمانے سے جھوٹی حدیثیں بیان کرنے لگے۔ توجیہہ النظر صفحہ ۲۴۶ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں اُن کے اوپر جھوٹ بولا گیا۔ اور عصرِ صحابہؓ میں بھی منافقین اور مرتدین تھے۔

علاوہ منافقین اور مرتدین کے عہدِ صحابہ میں جب روایتیں عوام میں پھیلیں تو مبالغہ اور کذب ان میں شامل ہوگیا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ "بشیر بن کعب نے حضرت ابن عباسؓ کے سامنے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ انہوں نے کچھ توجہ نہ کی۔ بشیر نے پوچھا کہ کیا بات ہے جو آپ میری نہیں سنتے؟ فرمایا کہ کبھی وہ زمانہ تھا کہ اگر کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں بیان کرتا تو ہم اس کی طرف لپکتے اور کان لگا کر سنتے۔ مگر جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب دیابس روایتیں کرنی شروع کر دیں، اس وقت سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔

صحابہ کے بعد بتدریج کذابین اور وضاعین کی کثرت ہوتی گئی۔ کیونکہ بنی اُمیہ کے زمانے میں سلطنت اور مذہب میں تفریق ہوجانے کے باعث اہلِ روایت کے سروں پر فاروقی دُرّہ نہ رہا اور ان کو موقع ملا کہ آزادی کے ساتھ سچی

یا جھوٹی جس قسم کی روایتیں چاہیں بیان کریں. خلفائے اُمیّہ بالعموم حدیث کو بہ نسبت قرآن کے اپنی سلطنت اور استبداد کے لئے زیادہ موجبِ عافیت سمجھتے تھے. انہوں نے خود حضرت علیؓ کو بر سرِ منبر بُرا کہنے کی رسم ڈالی تھی اور سینکڑوں حدیثیں ان کے مثالب اور امیر معاویہ وغیرہ کے مناقب میں وضع کرائی تھیں. عہدِ عباسی میں ایک ایک خلیفہ کی پیش گوئی اور مدح کی حدیثیں وضع ہوئیں. یہاں تک کہ یہ حدیث بھی پھیلائی گئی کہ کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان نہیں داخل ہوتا جب تک کہ حضرت عباس اور ان کی اولاد سے محبت نہ رکھے[1]. اور بنی اُمیّہ کے خلاف تو اُن کے دعاۃ آغازِ تبلیغ ہی سے حدیثیں گھڑتے تھے. اس عہد میں کذب اور وضع کا بازار اس قدر گرم ہوا کہ ہزاروں پیشہ ور کذّاب پیدا ہوگئے جن کا رات دن یہی کام تھا کہ حدیثیں گھڑیں.

بیشتر وضاعین اپنی وعظ گوئی اور قصہ خوانی کی وجہ سے عوام پر اس قدر اثر رکھتے تھے کہ نہایت مقدس اور بزرگ سمجھے جاتے تھے اور ائمہ حدیث ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے. ذہبی نے میزان الاعتدال میں شعبی کا جو تابعین میں کوفہ کے سب سے بڑے امامِ حدیث تھے، بیان نقل کیا ہے کہ "میں ایک مسجد میں نماز پڑھنے لگا. اس میں ایک دراز ریش واعظ کھڑا ہوا تقریر کر رہا تھا کہ "اللہ نے دو صور پیدا کئے ہیں، ہر ایک دو دو بار پھونکا جائے گا. میں نے جلدی سے نماز ختم کر کے اس سے کہا کہ اے شخص اللہ سے ڈر اور جھوٹی حدیثیں نہ بیان کر. صور تو صرف ایک ہی ہے. وہ خفا ہوا اور بولا کہ کیسا فاجر آدمی ہے کہ بڑے بڑے آدمیوں کو جھٹلاتا ہے. اس کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ عوام مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے اور جب تک مجھ سے اقرار نہ لے لیا کہ اللہ نے تین صور پیدا کئے' اس وقت تک نہ چھوڑا.

موضوعاتِ کبیر میں ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ ایک قصہ گو نے مقامِ محمود کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے ساتھ عرش پر بیٹھیں گے. امام ابن جریر طبری نے اس کی مخالفت کی اور اپنے دروازے پر لکھ دیا کہ اللہ کا کوئی ہم نشیں نہیں ہے. بغداد کے لوگ اس پر بگڑ گئے اور امام موصوف کے دروازے پر اس قدر پتھراؤ کیا کہ اس کا مُنہ ڈھک گیا.

امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معینؒ نے جو ائمہ حدیث میں بلند ترین مقام رکھتے ہیں' ایک بار بغداد کے محلہ رصافہ میں نماز پڑھی. مسجد میں ایک قصاص نے تقریر شروع کی کہ میں نے سُنا احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معینؒ

---

[1] توجیہ النظر، ص ۱۷.

سے، انہوں نے معمر سے، انہوں نے قتادہ سے، انہوں نے حضرت انسؓ سے اور انہوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جب کوئی بندہ لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے تو اللہ اس کلمہ کے ہر ہر حرف سے ایک ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی چونچ سونے کی ہوتی ہے اور پَر زمرد کے۔ (آخر تک تقریباً بیس ورق کی روایت) اس طویل داستان کو سُن کر دونوں حضرات نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر یحییٰ بن معین نے قصاص کو اپنی طرف بلایا اور پوچھا کہ یہ حدیث تم نے کس سے سُنی ہے؟ اس نے کہا یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل سے۔ انہوں نے کہا کہ میں یحییٰ ہوں اور یہ ابنِ حنبلؒ۔ ہم دونوں میں سے کسی نے آج سے پہلے اس روایت کو سُنا تک نہیں۔ تم کو اگر جھوٹ بولنا ہی تھا تو کسی اور کا نام لیا ہوتا۔ اس نے کہا کہ میں نے سُنا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے۔ آج اس کی تصدیق ہو گئی۔ پوچھا یہ کیونکر؟ بولا کہ سترہ یحییٰ بن معین ہیں اور سترہ احمد بن حنبل جن سے میں روایت کرتا ہوں۔ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ دنیا میں بس ایک تم ہی یحییٰ بن معین ہو؟ یہ سُن کر انہوں نے آستین مُنہ پر رکھ لی اور چپ چاپ چلے آئے[1]۔

ان مذکروں اور واعظوں کی مقبولیت اس قدر تھی کہ جمہور ان ہی کو اپنا ہادی سمجھتے تھے اور ان ہی کی بات مانتے تھے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کی والدہ کا قصہ ہے کہ انہوں نے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحب نے اس کا جواب دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں اُس وقت تک نہیں مانوں گی جب تک کہ مسجد کوفہ کا قصاص زوعہ اس کی تصدیق نہ کرے۔ چنانچہ امام صاحب ان کو خود ساتھ لے کر گئے اور جب زوعہ نے کہہ دیا کہ فتوٰے صحیح ہے، تب انہوں نے تسلیم کر لیا۔

امام ذہبیؒ نے میزان الاعتدال میں جعفر بن حجاج سے نقل کیا ہے کہ محمد بن عبداللہ نے موصل میں پہنچ کر عجیب و غریب حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ علمائے حدیث کو جب خبر ہوئی تو ان میں سے چند نے چاہا کہ چل کر اس کی تردید کر دیں۔ وہ ایک مجمع میں سرگرمِ تقریر تھا۔ جب علماء کو اپنی طرف آتے دیکھا تو معاملہ سمجھ گیا۔ فوراً ایک روایت حضرت جابر سے پیدا کرنی شروع کر دی کہ "قرآن کلام اللہ ہے اور غیر مخلوق"۔ اب عوام کے خوف سے ان علماء کو جرأت نہ ہو سکی کہ آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہہ سکیں[2]۔

---

[1] الموضوعات الکبریٰ مصنف ابن جوزی۔

[2] کیونکہ اس زمانہ میں یہی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ جو عالم قرآن کو غیر مخلوق کہہ دیتا وہ عوام میں مقبول ہو جاتا۔ پھر اس کی کوئی بات قابلِ تردید خیال نہ کی جاتی۔

یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کے خلاف اگر ائمہ حدیث کچھ کہتے تو ان کے معتقدین آکر بحث و مجادلہ کرتے. امام داوٗد طائیؒ نے اسی خوف سے روایت چھوڑ دی تھی اور کہا کرتے تھے کہ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ لوگ میرے پاس آتے ہیں اور جب میں کچھ لکھوا دیتا ہوں تو میری غلطیاں نکالتے ہیں. امام اعمشؒ کہتے تھے کہ واللہ تم لوگوں نے حدیثوں کو رد کرکے میرے حلق میں ان کو عود سے بھی زیادہ تلخ بنا دیا ہے. تم جس کی طرف رُخ کرتے ہو اس کو جھوٹ بلوا کے چھوڑتے ہو. اور ابنِ مزرع کہا کرتے تھے کہ جب کسی شیخ کو بھاگتا ہوا دیکھو، سمجھ لو کہ اس کے پیچھے اصحابِ حدیث ہیں[1].

سینکڑوں واضعین حدیث ایسے بھی تھے جو مخفی طور پر جھوٹی حدیثیں گھڑتے اور اُن کو اپنی جماعت میں پھیلاتے. اگر ان کا پایۂ اعتبار کم ہوتا تو بڑے بڑے ثقہ راویوں کے ناموں سے روایت کرتے. بعض ایسے بھی تھے جو اپنے شیوخ کے مشابہ خط میں اپنی مکذوبات چوری سے ان کی کتابوں میں درج کر دیتے. کچھ لوگ اور ثواب کا کام سمجھ کر حدیثیں بناتے تھے. روایات کا تو کیا ذکر، بعض وضاعین نے تو حدیث کی پوری پوری کتابیں تصنیف کر ڈالیں جو اوّل سے آخر تک موضوع ہیں. اس قسم کی چند کتابوں کے نام اور ان کے حالات تذکرۃ الموضوعات میں ہیں. علامہ ابن جوزی نے وضع حدیث کے مندرجہ ذیل اسباب لکھے ہیں:-

(۱) بعض لوگوں نے جن کے اوپر زُہد غالب تھا، حفظ میں غفلت کی اور کچھ کا کچھ بیان کرنے لگے.

(۲) بعض اہلِ علم کی یادداشتیں ضائع ہوگئیں اور انہوں نے مجبوراً حافظہ سے کام لیا اور جو خیال میں آیا کہہ گئے.

(۳) بہت سے ثقہ راویوں نے بھی جن کی عقلوں نے بڑھاپے میں جواب دے دیا تھا، غلط روایتیں کیں.

(۴) ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے غلط روایتیں کر دیں اور بعد میں باوجود اپنی غلطی کے علم کے، اس سے رجوع کرنا شان کے خلاف جانا.

(۵) زنادقہ نے (یعنی ان عجمیوں نے جو بظاہر مسلمان ہوگئے تھے لیکن درپردہ اسلام کو مٹانے کی فکر میں تھے. اور عہدِ عباسی میں ان کی تعداد کچھ کم نہ تھی) ایسی حدیثیں گھڑیں، جو شریعت کو

[1] مختصر جامع بیان العلم، ص ۱۸۱ - ۱۸۳-

فنا کرنے والی ہیں۔[1]

(۶) جب مذہبی تفریق پیدا ہوئی اور سنی، شیعہ، خارجی، قدری، جہمی، مرجیہ اور معتزلہ وغیرہ فرقے بن گئے۔ اس وقت ان میں سے اکثر نے اپنی تائید اور دوسروں کی تردید میں حدیثیں وضع کیں۔

(۷) بہت سے عابد و زاہد لوگ ایسے تھے جو عوام کو اچھے کام کی رغبت دلانے اور بُرے کام سے ڈرانے کے لئے حدیثیں گھڑتے تھے۔

(۸) بعض کا خیال یہ تھا کہ ہر پسندیدہ قول کے لئے اسناد ترتیب دے لینا اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کر دینا جائز ہے۔ اور عملاً ایسا ہی کیا کرتے تھے۔[2]

(۹) خلفاء و امراء کے مقربین اور حاشیہ نشین ان کے حسبِ منشاء روایتیں گھڑتے اور ان کو اپنے تقرّب کا ذریعہ بناتے تھے۔

(۱۰) قصہ گو واعظ اور مذکّر طرح طرح کے افسانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کرتے تھے، کیونکہ ان کی گرم بازاری کا سرمایہ یہی تھا۔

یہ دس وجوہات ہیں، جن کے باعث مکذوب و مجعول روایتیں امت میں پھیلیں، لیکن ان سب سے بڑھ کر سیاسی جماعتوں نے جو دین کی راہ سے عوام کے قلوب کو مسخّر کرنا چاہتی تھیں، حدیثیں بنائیں اور کبھی ان کو مخفی اور کبھی اعلانیہ مشرق سے مغرب تک پھیلایا اور ان سے بھی زیادہ ان جاہ پسندوں نے روایتیں گھڑیں، جو اپنے علم و تقدس کا سکّہ جما کر بزرگی اور عظمت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ان وضّاعین کی موضوعات سے حدیث پر ایسی آفت آئی جس کا اندازہ مشکل ہے۔ کیونکہ یہ وضّاعین حدیث کی رگ رگ میں گھس گئے تھے اور اس کا کوئی باب اور کوئی شعبہ انہوں نے ایسا نہیں چھوڑا جس میں اپنے حسبِ منشاء

---

[1] یہ لوگ مدح کے پیرایہ میں سیرت رسولؐ کو معیوب، قرآن کی آیات کو محرف اور شریعت کو ناقص دکھاتے نیز اپنے عقائد کو اسلامی تعلیمات میں شامل کرنے کی کوشش کرتے تھے جن کا اثر آج بھی کتبِ تفسیر و حدیث میں باقی ہے۔

[2] تذکرۃ الموضوعات (از محمد طاہر گجراتی) میں ہے کہ ایک محدث نے آخر عمر میں وضع حدیث سے توبہ کی۔ اس وقت اس نے کہا کہ حدیثوں کو ذرا دیکھ بھال کر قبول کیا کرو۔ کیونکہ ہم لوگ جب کسی بات کو اپنے حسبِ منشاء پاتے تھے تو اس کو دین بنا لیتے تھے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔

حدیثیں نہ تراشی ہوں اور ایک ایک سچ میں سو سو جھوٹ نہ ملایا ہو۔ پورے باب کے باب موضوع ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ ملاحم (پیش گوئیاں) مغازی (لڑائیاں) اور تفسیر[1]۔ ان تینوں ابواب میں کس قدر حدیثیں ہیں؟ ان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود امام موصوف کے ایک رفیق ابو زرعہ کو صرف تفسیر میں ایک لاکھ چالیس ہزار حدیثیں یاد تھیں[2]۔

کذب کا تسلط یہاں تک ہوا کہ روایات تو کیا، کئی ایک موضوع صحابی بنا لئے گئے۔ تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۱۰۲ میں ہے:۔

جملہ مؤرخین متفق ہیں کہ روئے زمین پر سب سے آخری صحابی جو رہ گئے تھے وہ حضرت ابو الطفیل عامر بن وائلہ ہیں جنہوں نے مکہ مکرمہ میں ۱۰۲ھ میں وفات پائی۔ ان کے بعد چھٹی بلکہ ساتویں صدی ہجری میں طویل العمر صحابہ مخترع کر لئے گئے جن میں سے یہ لوگ ہیں۔

۱۔ جبیر بن حرب ــ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ان کے متعلق مشہور تھا کہ غزوۂ خندق میں شریک تھے۔ امیر عبدالکریم کا بیان ہے کہ میں نے امام ناصر کے ساتھ ۵۶۳ھ میں ان کی زیارت کی تھی۔

۲۔ ابو عبداللہ صقلی، پانچویں صدی ہجری میں تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا ہے، اس لئے لوگ جا جا کر تبرکاً اُن سے مصافحہ کرتے تھے۔

۳۔ قیس بن یتیم گیلانی ــ ان کی پیشانی پر ایک نشان تھا جس کی نسبت مشہور کیا گیا تھا کہ حضرت علیؓ کے خچر نے لات ماردی تھی۔ چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں ان سے حدیثیں روایت کی جاتی تھیں۔

۴۔ بابا رتن ہندی ــ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تقریب میں شریک تھے۔ یہ ہندوستان میں رہتے تھے۔ ۶۳۲ھ میں وفات پائی۔

ان زندہ صحابیوں کو کھڑا کر کے ان کی زبانوں سے طرح طرح کی روایتیں امت میں پھیلائی جاتی تھیں۔ بعض لوگ سندِ عالی کے خیال سے ان کو اپنی بیاضوں میں درج کر لیتے تھے[3]۔ علماء کی ذہنیتوں کا حال یہ تھا کہ جب ائمہ حدیث

---

[1] تذکرۃ الموضوعات، مصنف محمد طاہر گجراتی، ص ۸۲۔ [2] توجیہہ النظر، ص ۴۔

[3] تذکرۃ الموضوعات کے ص ۱۰۶ میں علامہ آفاق شہری کا قول نقل کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہر چند "رتنیات" کی صحت پر وثوق نہیں مگر ان کی سند سے برکت حاصل کی جاسکتی ہے۔

ان خرافات کا انکار کرنے لگے تو ان کے ساتھ مجادلہ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ امام ذہبی نے بابا رتن کی جملہ روایتیں موضوعات میں شامل کیں۔ اس پر علامہ مجدّد الدین صاحب قاموس بگڑ بیٹھے اور حافظ ابنِ حجر نے جب ان باتوں کی تغلیط کی تو علامہ صفدی نے سختی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔

اس مختصر کیفیت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ روایانِ حدیث میں کذابوں اور وضاعوں کا عنصر کس قدر غالب تھا اور جمہور میں ان کی قدر دانی کی کتنی صلاحیت موجود تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ اُمت جس کے پاس قرآن جیسی کامل اور روشن کتاب ہو، کذب کے ایسے تاریک غار میں گر جائے۔ جامعینِ حدیث نے جس وقت حدیثوں کو مدوّن کیا، اس وقت جو کچھ بھی ذخیرہ روایات کا ان تک پہنچا تھا، کتابوں میں لکھ دیا۔ صرف خال خال روایتوں کو جن کا موضوع یا مکذوب ہونا بالکل ہی عیاں تھا، چھوڑ دیا[1]۔ یہ حدیثیں اسناد کے ساتھ جمع کی گئی تھیں۔ یعنی ان راویوں کے ناموں کے ساتھ جن کے ذریعے سے پہنچی تھیں، اس کے بعد سے تنقید کا سلسلہ شروع ہوا اور صحیح یا غلط کی چھان بین ہونے لگی۔

تنقیدِ حدیث

اس تنقید میں ائمہ حدیث نے دو چیزوں کو سامنے رکھا۔ ایک متنِ حدیث کو، دوسرے رواۃ کو، موضوع متن کی شناخت کے لئے انہوں نے حسبِ ذیل اصول قرار دیئے۔

(۱) عقل کے خلاف ہو۔

(۲) فطرت کے خلاف ہو۔

(۳) قرآن کے خلاف ہو۔

(۴) تاریخ کے خلاف ہو۔

(۵) موقعہ یا قرینہ کے خلاف ہو۔

(۶) رافضی صحابہ کے یا خارجی اہلِ بیت کے مطاعن میں روایت کرتا ہو۔

(۷) چھوٹے چھوٹے عمل پر بڑے بڑے اجر کا وعدہ یا چھوٹے چھوٹے گناہ پر بڑے بڑے عذاب کی وعید ہو۔

(۸) واقعہ ایسا ہو جس کے بیان کرنے والے بہت سے لوگ ہو سکتے ہو۔ مگر صرف ایک ہی شخص

---

[1] توجیہہ النظر، ص ۱۹۔

روایت کرتا ہو۔

لیکن ان اصولوں سے صرف تھوڑی سی غلط اور موضوع حدیثیں پکڑی جا سکیں، کیونکہ جو لوگ حدیثیں تراشتے تھے، وہ اس کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیتے تھے، تاکہ کہیں سے گرفت نہ ہو سکے۔ علاوہ بریں محدثانہ تاویلات کا دروازہ ایسا کھلا ہوا تھا کہ جہاں کوئی روایت عقل یا قرآن وغیرہ کے خلاف معلوم ہوتی، فوراً مطابقت پیدا کر لی جاتی۔

لہٰذا یہ اصول جو غلط روایتوں کو پہچاننے کے لئے مقرر کئے گئے تھے، تقریباً بے کار ثابت ہوئے۔ اس لئے ان نقادوں نے دوسری چیز یعنی رواۃ کی جانچ پر زیادہ مدار رکھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ حضرات نبی تو تھے ہی نہیں کہ سوڈیڑھ سو سال سے ہزارہا وضاعین اور کذابین جو پیدا ہوتے چلے آ رہے تھے اور جن میں سے اکثر جمہور میں مقبول اور محترم بھی تھے، ان کو الہامِ الٰہی سے شناخت کر لیتے۔ ان کے پاس ان کے پہچاننے کا جو کچھ ذریعہ تھا وہ بھی روایات ہی کا تھا۔ یعنی ہر ایک راوی کے صدق و کذب کی بنیاد انہوں نے ان روایات پر رکھی جو اس کے متعلق لوگوں سے پہنچی تھیں۔

عہدِ صحابہؓ نیز تابعینؒ میں ضعفاء اور کذابین کم تھے۔ اس کی وجہ سے ان کی بابت کلام بھی کم کیا گیا ہے۔ صرف امام شعبی، ابن سیرین اور سعید بن المسیب سے بعض کے متعلق جرح مذکور ہوئی ہے، دوسری صدی ہجری کے وسط میں امام اعمش اور مالک وغیرہ نے ضعفاء کا کھوج لگانا شروع کیا۔ پھر معمرؔ، ہشامؔ، دستوائیؔ، اوزاعیؔ، سفیانؔ ثوری، ابن الماجشون اور حمادؔ بن سلمہ وغیرہ نے، ان کے بعد یحییٰ بن سعید القطان متوفی ۱۹۸ھ اور ابنِ مہدی رجال کے مستند امام مانے گئے، لیکن ان کے زمانے تک یہ علم زبانی تھا، تیسری ہجری سے اس میں تدوینِ کتب شروع ہوئی جن میں ایک ایک راوی کے حالات جمع کئے گئے اور اس کے اوپر جرح و تعدیل ہونے لگی۔ اس عہد کی نامور شخصیتیں دو ہیں۔ امام یحییٰ بن معین، متوفی ۲۳۳ھ اور احمد بن حنبلؒ متوفی ۲۴۱ھ۔ جن کے بعد یہ سلسلہ پھیل گیا اور اس فن کے سینکڑوں امام ہوئے اور اس میں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں[1]۔ مگر چونکہ صدق و کذب، باطنی صفات میں سے ہیں جن کے اوپر یقینی شہادت ہو ہی نہیں سکتی، اس وجہ سے رواۃ کے متعلق بے حد اختلافات ہوئے ہزاروں ہیں جن کو اگر ایک سچا کہتا ہے تو دوسرا جھوٹا۔

[1] توجیہہ النظر، ص ۱۱۴۔

رہے ظاہری اوصاف یعنی زہد و عبادت وغیرہ تو ان کے متعلق خود محدثین کا تجربہ بہت تلخ ہے۔ امام یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ اہلِ صلاح وخیر سے زیادہ حدیث کے معاملہ میں کوئی جھوٹا نہیں ہوتا۔ امام مسلم اپنی "صحیح" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ اہلِ خیر کی زبان سے بلا ارادہ بھی جھوٹ نکلتا ہے۔ ایوب سختیانی نے اپنے ایک پڑوسی کے علم و زہد اور عبادت و طہارت کی بہت تعریف کی۔ مگر اس کے بعد کہا کہ اگر وہ میرے سامنے ایک کھجور کے معاملہ میں بھی گواہی دے تو میں قبول نہیں کروں گا[1]۔ اس لئے مجبوراً توثیق کی بنیاد محض مقبولیت اور شہرت پر رکھی گئی اور مقبولیت و شہرت کا یہ حال ہے کہ جو لوگ مسلّم امام ہیں وہ بھی جرح سے محفوظ نہیں ہیں، بلکہ جب ہم ان کے متعلق ان کے ہم عصر اماموں کی رائیں سنتے ہیں تو ہم کو ان کی امامت میں شک ہونے لگتا ہے۔ اس قسم کے چند اقوال حافظ ابن عبدالبر کی کتاب مختصر جامع بیان العلم کے صفحہ ۱۹۶ سے نقل کرتا ہوں۔

امام حماد بن ابی سلیمانؒ جو امام ابو حنیفہؒ کے استاد ہیں، جب مکّہ کے سفر سے عراق میں واپس آئے اور لوگ ان کے پاس جمع ہوئے تو کہا کہ عراقیو! اللہ کا شکر کرو میں نے علمائے حجاز کو دیکھا۔ واللہ تمہارے بچے، بلکہ بچوں کے بھی بچے ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔" اور یہ علمائے حجاز کون تھے؟ عطاء بن ابی رباح، طاؤس، عکرمہ اور مجاہد وغیرہ جو سارے عالمِ اسلامی میں مستند مانے جاتے ہیں۔

انہی حماد کے استاد ابراہیم نخعی کا ذکر امام شعبی کے سامنے آیا تو انہوں نے کہا کہ وہ رات کو آ کر ہم سے پوچھتا ہے اور صبح کو فتوے دیتا ہے۔ امام ابراہیم نے جب یہ بات سُنی تو کہا کہ شعبی کذّاب ہیں وہ مسروق سے روایت کرتے ہیں، حالانکہ ایک لفظ بھی ان سے نہیں سُنا ہے۔

امام مغازی محمد بن اسحٰق کے پاس امام مالکؒ کا ذکر ہوا تو کہا کہ ان کی روایتیں میرے سامنے پیش کرو، میں ان کا بیطار ہوں۔ جب امام مالکؒ نے یہ بات سنی تو فرمایا کہ ابنِ اسحٰق دجال ہے۔

ایک بار امام مالکؒ سے کسی نے علمائے عراق کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ ان کو بمنزلہ

---

[1] توجیہہ النظر، ص ۲۵۔

اہلِ کتاب کے سمجھو، نہ ان کی تصدیق کرو، نہ تکذیب." (یہ علمائے عراق کون تھے؟ حنفیہ سے پوچھئے)۔

امام ابو حنیفہؒ امام اعمشؒ کی بیمار پُرسی کو گئے۔ اٹھتے وقت کہا کہ اگر میرا آنا آپ کے اوپر گراں نہ گزرتا تو میں اس سے زیادہ عیادت کے لئے حاضر ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ تمہارا تو اپنے گھر میں رہنا بھی میرے اوپر گراں ہے، چہ جائیکہ یہاں آنا۔ باہر نکل کر امام ابو حنیفہؒ نے کہا کہ اعمشؒ کی نہ کبھی نماز ہوئی نہ روزہ۔

اس قسم کی باتوں کے متعلق محدّثین یہ کہتے ہیں کہ ہمعصر علماء میں باہمی رقابت رہا کرتی ہے۔ اس وجہ سے ان کے اقوال ایک دوسرے کی نسبت قابلِ اعتنا نہیں ہیں اور ان سے کسی کی امامت میں فرق نہیں آتا۔ میں اس جواب کی صحت پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ان ائمہ کی رایوں پر جب معاصرانہ چشمک غالب آجاتی تھی تو دوسرے جذبات کیوں غالب نہیں آسکتے تھے۔ ہم تو صاف دیکھ رہے ہیں کہ رواۃ کی توثیق صرف ان کے صدق کی بنا پر نہیں کی گئی تھی بلکہ استادی شاگردی اور ہم خیالی کے عواطف و میلانات بھی اس میں شریک ہیں۔ جہاں کسی امر میں اختلاف ہوتا ہے وہاں بڑے سے بڑے ثقہ پر بھی جرح ہو جاتی ہے۔ حارث ہمدانی مسلّمہ طور پر ثقہ تھے جن کا کبھی جھوٹ ثابت نہیں ہوا مگر چونکہ حضرت علیؓ کی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ اس وجہ سے شعبیؒ نے ان کو کذاب کہہ دیا[۱]۔ اور پھر رفتہ رفتہ وضّاعین میں شمار کئے گئے۔ بہت سے لوگوں نے امام ابو حنیفہؒ کے متعلق بعض اختلافات کی بناء پر کلام کیا۔ ابن ابی ذئب اور عبد العزیز بن سلمہ وغیرہ نے چند مخصوص مسائل کی وجہ سے امام مالکؒ پر جرح کی۔ خود یحییٰ بن معینؒ نے امام شافعیؒ کو غیر ثقہ قرار دیا[۲]۔ اسی طرح سینکڑوں ائمہ ہیں جو محض اختلافاتِ خیال کے باعث مجروح کئے گئے۔ اسی کا ماتم کرتے ہوئے ہارون الرشید کے عہد کے نامور شاعر ابو العتاہیہ نے کہا:

بکی شجرة الاسلام من علمائه فما اکثر المرأ دا من بکائه
واکثرهم مستقبح بصوابه بخالفه مستحسن لخطائه

---

[۱] مختصر جامع بیان العلم، ص ۱۹۷۔

[۲] مختصر جامع بیان العلم، ص ۲۰۱۔

فایھم المرجو فینا لدینہ
وایھم الموثوق فینا لرائہ

اسلام اپنے علماء کے دُکھ سے رو پڑا اور انہوں نے اس کو روتے دیکھ کر پروا نہ کی۔
ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اپنے مخالف کی صحیح بات کو بھی بُری اور اپنی غلط بات کو بھی اچھی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کس سے دین کی امید رکھیں اور کس کی رائے پر اعتماد کریں۔

الغرض جرح و تعدیل کا فن سرتا سر قیاسی ہے اور اس قیاس میں بھی جذبات اور عواطف کے علاوہ تسامح سے کام لیا گیا ہے۔ تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ:۔

امام احمد بن حنبل، ابنِ مہدی اور ابن مبارک تینوں کا بیان ہے کہ ہم حلال اور حرام کی روایتوں کی جانچ میں سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایتوں میں نرمی۔

شروع سے آخر تک ان میں نرم اور گرم دو فریق رہے ہیں۔ طبقہ اوّل میں امام شعبیؒ سخت تھے اور سفیان ثوری نرم۔ دوم میں ابنِ مہدی نرم تھے اور یحییٰ بن سعید القطان سخت۔ سوم میں احمد بن حنبل بمقابلہ ابنِ معین کے نرم تھے اور چہارم میں ابو حاتم بمقابلہ امام بخاری کے سخت۔

اس لئے رواۃ کی توثیق یا تضعیف تمام تر تخمین پر مبنی ہے اور صرف حدیثیں ظنی نہیں ہیں۔ ان کے جانچنے کا معیار بھی ظنی ہے اور یہ وہ بات ہے جس کو خود محدثین نے تسلیم کیا ہے۔ مُلّا علی قاری موضوعاتِ کبیر صفحہ ۱۷ میں لکھتے ہیں۔

یہ (حدیثوں کی صحت) تمام تر وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آئی ہے، ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں۔ کیوں کہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انہوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

اس لئے کسی حدیث کی نسبت یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ قولِ رسولؐ ہے بلکہ صرف یہ کہ وہ ایک قول ہے جو رسولؐ کی طرف منسوب ہے۔ خواہ اس کی نسبت صحیح ہو یا غلط۔ امام مالکؒ یہ آیت پڑھا کرتے تھے کہ

(فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحۡنُ بِمُسۡتَیۡقِنِیۡنَ (۴۵/۳۲)

ہم تو صرف گمان کرتے ہیں۔ ہم کو یقین حاصل نہیں ہے۔

پھر ایک بڑا سوال یہ ہے کہ رجال اسناد کے ثقہ ثابت کرنے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ متنِ حدیث بھی صحیح ہو، اس لئے کہ وضاعین اپنی موضوعہ روایات کے ساتھ معتبر سند لگا دیتے تھے تاکہ کوئی ان کو غلط نہ کہہ سکے۔ ان کے پاس سترہ یحییٰ بن معین اور سترہ احمد بن حنبل ہوتے تھے۔ لہٰذا، پہلا اصول تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جو روایت جس سند کے ساتھ مروی ہے اس کی صحت کا ثبوت بہم پہنچایا جائے، اور دوسرا یہ کہ جس کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ایک کا قول کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے، اس کی کوئی روایت تسلیم نہ کی جائے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے برخلاف اس تدلیس کے عیب میں بڑے بڑے ائمہ مبتلا ہیں۔ مثلاً امام حسن بصریؒ، مکحول شامی، سفیان ثوری، سفیان ابنِ عینیہ، ابراہیم نخعی، مالک، انس اور دارقطنی وغیرہ[1]۔ اس لئے روایات کی تنقید کا یہ طریقہ بھی بےکار ثابت ہوا۔

علاوہ بریں یہ تقوے کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی۔ کیونکہ جس امت کے ہاتھ میں قرآن جیسی کتاب موجود ہے جس میں "الیوم اکملت لکم دینکم" فرما کر اللہ نے دینِ اسلام کو مکمل کر دیا ہے، اس کو دین کی تلاش کے لئے کب جائز ہے کہ مرے ہوئے ائمہ اور رواۃ کے گڑے مردے اکھیڑ کر جرح و تعدیل کے مسلخ میں لائے اور ہر ایک کی پوست کشی کر کے اس کے صدق و کذب کا پتہ لگانے کی کوشش کرے، وہ بھی محض لوگوں کے بیانات سے۔ چنانچہ امام یحییٰ بن معین نے جب سب سے پہلے تاریخ الرجال لکھی اور اس میں سینکڑوں رواۃ حدیث کو جہاں ثقہ و صادق قرار دیا، وہاں ہزاروں کو کذاب اور دجال کہا۔ اس وقت علمائے امت پر یہ امر اس قدر شاق گزرا کہ انہوں نے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ بکر بن حماد شاعر نے کہا؛

لابن معین فی الرجال مقالۃ
سیسئل عنہا والملیك شہید

(سابقہ صفحہ کا فٹ نوٹ) مختصر جامع بیان العلم، ص ۱۱۳۔

[1] طبقات المدلسین لابن حجر۔

فان کان حقا قولہ کان غیبتہ
وان کان زوداً فالقصاص شدیدا

ابن معین نے لوگوں کے بارے میں باتیں کہی ہیں جن کی بابت اللہ
کے سامنے ان سے سوال کیا جائے گا۔ اگر وہ سچی ہیں تو غیبت ہیں۔
اور اگر جھوٹی ہیں تو سزا سخت ہوگی [1]

لیکن محدثین کو چونکہ حدیثوں کو صحیح یا غلط قرار دینے کے لئے ایک معیار کی ضرورت تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے کوئی پروا نہیں کی اور اس سلسلے کو بڑھا کر ایک مستقل فن بنا لیا اور آج تو وہ بڑے فخر کے ساتھ ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "مسلمان اس خصوصیت میں ممتاز ہیں کہ انہوں نے اپنے پانچ لاکھ علماء کے حالات محفوظ رکھے۔"

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پانچ لاکھ میں سے ایسے حضرات کے سوا جنہوں نے اعلائے کلمۃ الحق یا ملت کی تعمیر میں کارنامے چھوڑے ہیں۔ بقیہ کے متعلق جن کا کام سوائے روایت کشی کے اور کچھ نہ تھا، یہ دریافت کرنا کہ ان کا نام کیا تھا، ان کی کنیت کیا تھی، ان کے کون کون استاد تھے اور کون کون شاگرد، ان کی کس قدر روایتیں صحیح ہیں اور کس قدر غلط وغیرہ وغیرہ کوئی مفید یا قابلِ فخر تاریخی علم نہیں ہے بلکہ ملت کے لئے ایک قسم کی دماغی تعزیر ہے جو روایت پرستی کے سبب سے ملی ہے۔

اصولِ حدیث

اصولِ حدیث سے یہاں میری مراد اس کی اصطلاحات نہیں، بلکہ وہ قواعد ہیں جن کو محدثین نے روایت میں مرعی رکھا۔ یہ اصول تقریباً سب کے سب ناقص اور نظری حیثیت سے نہایت کمزور ہیں۔ اس موقع پر میں ان میں سے صرف ان اصولوں کو لیتا ہوں جن سے حدیثوں کی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔

پہلا اصول روایت بالمعنیٰ کا ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایتیں کی گئیں وہ بلفظہٖ نہیں ہیں بلکہ بالمعنیٰ ہیں۔ اور بلفظہٖ ہو بھی کیسے سکتی تھیں۔ کیونکہ حضورؐ کی مجلس میں جو صحابہؓ موجود

[1] مگر شاعر کے خلاف ایک محدث نے یحییٰ بن معین کو ان کے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ کیسی گذری؟ انہوں نے کہا کہ اللہ نے مجھ کو چار سو حوریں بخش دیں۔ (کتاب الاسوار، جلد ۱، ص ۱۵۸)

ہوتے تھے' وہ نہ آپ کی باتیں لکھا کرتے تھے' نہ یاد کر کے سنایا کرتے تھے۔ اور ان کو بیان کرنے کا موقعہ بھی ایک مدت کے بعد پیش آیا۔ اس وجہ سے ان کے لئے انہی الفاظ کو نقل کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے تھے' متعذر تھا۔ لہٰذا وہ انہیں اپنے الفاظ میں بیان کرنے لگے۔ اور اس کو محدثین نے اصولاً جائز قرار دے لیا اور روایت بالمعنیٰ رائج ہو گئی[1]۔ حالانکہ بعض صحابہؓ حضرت ابنِ عمرؓ جیسے اس کو ناجائز سمجھتے تھے۔ اور وہ یا تو زبان بند رکھتے یا انہی روایات کو بیان کرتے تھے جن کے الفاظ ان کو یاد ہوتے تھے' کیونکہ لفظوں کے بدل جانے سے معانی میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہو جاتی ہے جو روایتِ حدیث میں یقیناً تقوےٰ کے خلاف ہے۔ حضرت عمران بن حصین نے کہا کہ دوسروں کی طرح اگر میں بھی روایتیں بیان کرنی چاہوں تو دو دن اور دو رات تک مسلسل بیان کر سکتا ہوں۔ کیونکہ جس طرح ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنی ہیں میں نے بھی سنی ہیں۔ مگر ڈرتا ہوں کہ انہی غلطیوں میں پڑ جاؤں گا جن میں دوسروں کو پڑتے ہوئے دیکھ رہا ہوں[2]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے الفاظ کی تبدیلی سے معانی بدلنے لگے تھے اور اختلاف پیدا ہونے لگے تھے۔ اور اہلِ نظر و صلاح اس سے عبرت پکڑتے تھے۔

تابعین میں سے بعض ائمہ مثلاً ابن سیرین' مالک' قتادہ اور ابوبکر رازی کے سوا بالعموم محدثین روایت بالمعنیٰ ہی کرتے تھے۔ امام سفیان ثوری نے کہا ہے کہ

> اگر میں تم سے کہوں کہ میری روایت کے الفاظ وہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے' تو مجھ کو سچا نہ جانو' میں تو بالمعنیٰ روایت کرتا ہوں[3]۔

یہی دوسرے محدثین بھی کہا کرتے تھے۔ قاضی بدر الدین نے اپنے استاد ابنِ مالک سے کہا کہ حدیثیں بالمعنیٰ مروی ہیں اور رواۃ زیادہ تر عجمی ہیں' جو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں پھر ہم کس طرح معلوم کریں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا اصل مفہوم کیا تھا؟ وہ چپ رہے اور کچھ نہ بولے[4]۔

ابوحیان نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ائمہ نحو نے جس قدر استشہاد کیا ہے' آیات سے کیا ہے' روایات سے نہیں کیا۔ کیونکہ ان کو الفاظِ حدیث پر وثوق نہیں تھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں[5]۔

---

[1] توجیہ النظر' ص ۳۰۰ ' [2] توجیہ النظر' ص ۱۱ ' [3] توجیہ النظر' ص ۳۱۳ ' [4] توجیہ النظر' ص ۳۱۲-۳۱۲۔

[5] توجیہ النظر' ص ۳۱۳-۳۱۲۔

اگر کسی روایت میں بعینہٖ الفاظ محفوظ ثابت ہو جائیں تو یہ اتفاقی امر ہے۔

روایات کے بالمعنیٰ ہونے سے حدیثوں کی منزلت میں بہت فرق آ گیا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے ان کی نسبت صرف معنوی رہ گئی اور صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ رواۃ کے الفاظ کہاں تک آپ کے بیان کے مدعا کے مطابق ہیں، اس لئے کہ کبھی کبھی صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے پورے کلام کا مفہوم بدل جاتا ہے اور یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ ایسی صورت میں الفاظِ حدیث سے کسی خاص مقصد پر استدلال نہایت بے بنیاد ہے کیونکہ معلوم نہیں کہ اصلی لفظ کیا تھا؟

دوسرا اصول خبرِ منفرد کی مقبولیت کا ہے، یعنی محدثین نے اُس روایت کو جس کا راوی درجہ میں صرف ایک ہی ہو۔ لیکن ان کے معیار کے مطابق ثقہ ہو، مقبول قرار دیا۔ علمائے محققین نے اسی وقت اس کی مخالفت کی۔ ابراہیم بن اسمٰعیل نے کہا کہ روایت بمنزلۂ شہادت کے ہے اس لئے جب تک ہر درجہ میں کم سے کم دو راوی نہ ہوں قبول نہیں کی جا سکتی۔ معتزلہ اور خاص کر ابو علی جبائی نے بھی سختی کے ساتھ ٹوکا۔ مگر محدثین نے کوئی التفات نہیں کیا، کیونکہ اس سے احادیث کے ایک بڑے حصہ سے ان کو دستبردار ہو جانا پڑتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ اور رازیؒ نے باوجود فلسفی اور معقولی ہونے کے، ان کے ساتھ موافقت کی ہے حالانکہ قرآن میں جب معمولی لین دین پر جو دنیاوی امور ہیں، دو مسلمانوں کو گواہ بنا لینے کا حکم دیا گیا ہے تو دینی امور میں کیوں دو گواہوں کی ضرورت نہیں ہے؟

خود روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین گواہ طلب کرتے تھے۔ قبیصہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس ایک عورت آئی جو اپنے پوتے کے ترکہ میں سے حصہ مانگتی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ میں کلام اللہ سے تیرا حصہ نہیں پاتا[1] فرمایا کہ کوئی تمہارے اس قول پر شاہد ہے۔ محمد بن مسلمہ نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں۔ اس وقت اس کو ایک سدس دلوا دیا[2]

اسی طرح حضرت عمرؓ کے دروازے پر ابو موسیٰؓ نے آواز دی، جب جواب نہ ملا تو واپس چلے گئے۔ اتنے میں فاروق اعظمؓ اندر سے نکل آئے اور پوچھا کہ آواز دینے کے بعد پلٹے کیوں؟ کہا کہ حضورؐ اکرم نے فرمایا ہے کہ جب تین بار پکارنے کے بعد جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ۔ فرمایا کہ گواہ لاؤ، ورنہ اچھی طرح خبر لوں گا۔ ابو موسیٰؓ

---

[1] حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ رسولؐ اللہ نے دادی کو سدس دلوایا ہے۔ [2] توجیہ النظر۔

کا رنگ خوف سے اُڑ گیا۔ بھاگے ہوئے مسجد کی طرف صحابہ کرامؓ کے پاس آئے۔ واقعہ سنایا اور کہا کہ کسی نے اگر سُنا ہو تو میرے ساتھ چلے، چنانچہ ایک صحابی نے جا کر شہادت دے دی تب حضرت عمرؓ نے ان کو چھوڑا[1]

مگر عہدِ صحابہؓ میں عینی شہادت کا ملنا ممکن تھا اس لئے اس وقت یہ طرزِ عمل بالکل حق بجانب تھا۔ لیکن زمانۂ مابعد میں راوی کی حیثیت شاہد کی نہیں رہی بلکہ مدعی کی ہو گئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امت کے جملہ افراد پر جن کی تعداد کروڑوں بلکہ ممکن ہے اربوں ہو جائے ایک عقیدہ یا عمل کی پابندی عائد کرنی چاہتا ہے اور اس کا بیان بھی واسطہ در واسطہ ہے، اس لئے اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ دو شاہد عادل پیش کرے جو گواہی دیں کہ اس نے فلاں سے ہمارے سامنے سُنا ہے۔ پھر اسی طرح سلسلہ کے آخر تک ہر راوی کی سماعت کے دو گواہ ہونے ضروری ہیں۔ بلا ان کے اصولِ عدالت اور قانونِ شریعت کے مطابق اس کا قول تسلیم کے قابل نہیں۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس جس قدر ذخیرہ روایات کا ہے اس میں ایک روایت ایسی نہیں جو اس طرح شہادتوں سے ثابت کی گئی ہو یا کی جا سکتی ہو؟ اس لئے تمام روایتیں غیر یقینی ہیں۔ روایت کی صرف ایک قسم یقینی ہو سکتی تھی، یعنی متواتر جس کی تعریف حافظ ابن حجر نے نخبۃ الفکر میں یہ لکھی ہے۔

> ایک تعداد کثیر جس کا عادتاً جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال ہو، اس کو روایت کرے اور ابتدا سے انتہا تک ان کی تعداد اتنی ہی کثیر ہو اور اس کی بنا محسوس پر ہو اور اس سے بداہتہً سامع کو یقین حاصل ہو جائے۔

یعنی خبر کے متواتر ہونے کے لئے چار شرطیں ہیں۔

(۱) اس کے راویوں کی تعداد اتنی کثیر ہو کہ ان کے کذب پر باہم اتفاق کر لینا عادۃً ناممکن ہو۔

(۲) ابتدا سے انتہا تک ہر درجہ میں اس کے راویوں کی تعداد اتنی ہی کثیر ہو۔ کسی ایک درجہ میں بھی اس سے کم ہوگی تو وہ متواتر نہ رہے گی۔

(۳) خبر متواتر کا مبنٰی محسوس ہو، اگر غیر محسوس ہوگا تو متواتر نہ ہوگی۔ مثلاً مکہ ایک شہر ہے۔ اس کو بیان کرنے والے خواہ ہزار ہی آدمی کیوں نہ ہوں، یہ خبر متواتر اور یقینی ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر کروڑوں آدمی

---

[1] توجیہ النظر، ص ۱۲۔

کہیں کہ عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں تو یہ خبر متواتر نہ ہوگی کیونکہ اس کا مبنیٰ غیر محسوس اور محض اعتقادی ہے۔

(۴) اس خبر کو سنتے ہی سامع کو یقین حاصل ہوجائے اور وہ کسی دلیل کا محتاج نہ رہے۔

ایسی حدیث جس میں یہ چاروں شرطیں پائی جائیں، متواتر اور مفیدِ یقین ہوگی اور اسی کو علمائے معقول یعنی منطقیوں نے یقینیات میں شمار کیا ہے۔ لیکن اس قسم کی متواتر حدیث کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابنِ صلاح نے جو باوجود اس کے حدیث کے معاملہ میں نہایت خوش اعتقاد ہیں لکھا ہے کہ اس تعریف کے مطابق متواتر حدیث کا ملنا مشکل ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ ان کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ایسی حدیثیں مل سکتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ محدّثین نے جن چار حدیثوں کے تواتر کا دعوےٰ کیا ہے ان میں تواترِ لفظی نہیں بلکہ معنوی ہے[1]۔ علاوہ بریں، انہوں نے تواتر کا مفہوم ہی بدل دیا ہے اور مشہور حدیث کو متواتر قرار دینے کی کوشش کی ہے جس کے یقینی ہونے کا ہرگز دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی صحابی یا امام نے کوئی روایت کی، جس کے بعد اس کے بیان کرنے والے حدِ شمار سے زیادہ ہوگئے تو وہ متواتر نہ ہوگی، کیونکہ اس میں رواۃ کی تعداد اوّل سے آخر تک یکساں نہیں ہے جو لوگ فرطِ عقیدت سے صحیحین کی روایتوں کو متواتر کہنے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً امام تیمیہ یا ابنِ صلاح، ان کے ساتھ اس حد تک موافقت کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مصنفین تک متواتر ہیں۔ مگر ڈھائی سو سال کا زمانہ جو ان سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تک ہے، اس میں خبرِ واحد ہی تھیں۔ زیادہ صاف لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ متواتر وہ ہے جس سے بداہتہً یقین حاصل ہو اور وہ دعویٰ، دلیل اور سند کی بھی محتاج نہ ہو اور ایسی کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ جملہ حدیثیں خبرِ واحد ہی ہیں اور ائمہ اصول نے تصریح کی ہے کہ خبرِ واحد مفیدِ یقین نہیں ہے۔

دلائلِ حدیث

محدّثین نے حدیث کی دینی حیثیت پر آیاتِ قرآنی سے بھی استدلال کی کوشش کی ہے، اس لئے ان کے جوابات بھی لکھنے ضروری ہیں تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوجائے۔

امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) نے اپنی کتاب الاُم کی ساتویں جلد میں اس جماعت کا ذکر کیا ہے جو حدیث کو دینی حجت نہیں مانتی تھی اور ان میں سے ایک کے ساتھ اپنی بحث کا بھی حال لکھا ہے۔ اس نے امام موصوف سے

---

[1] توجیہ النظر، ص ۴۷۔

سوال کیا کہ :-

قرآنِ کریم نے جو فرائض اُمت پر عائد کئے ہیں، ان میں سے تم کسی کو عام قرار دیتے ہو، کسی کو خاص، کسی کو لازم اور کسی کو مباح۔ اور یہ سب کچھ ان روایات کی بنا پر کرتے ہو جو ایسے لوگوں سے مروی ہیں جن میں سے اکثر کو نہ تم نے دیکھا نہ ان سے ملے۔ اور باوجود ان کی عدالت اور ثقاہت کے قائل ہونے کے بھی تم ان میں سے کسی کی نسبت یہ عقیدہ نہیں رکھتے ہو کہ وہ غلطی، غلط فہمی، خطا اور نسیان سے بھی بری ہے، پھر بھی ان کی روایتوں کو اس قدر برحق سمجھتے ہو کہ ان کی بنا پر احکامِ الٰہی میں تفریق کر ڈالتے ہیں۔

امام صاحب نے جو جواب دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات سے سنّت کی خبر صادق ہم تک پہنچتی ہے اور سنّت وہ ہے جس کو قرآن نے یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ میں حکمت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے نیز دوسری آیت ہے۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ق وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹/۷)

رسول جو کچھ تم کو دے وہ لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔

اس سے سنّت کی دینی حیثیت ثابت ہے۔ اس کے بعد امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سُن کر اس نے اپنے قول سے رجوع کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دلیلوں سے اس منکر کے قائل کر دینے کو ہم امام شافعیؒ کی کرامت ہی سمجھتے ہیں، ورنہ ان سے تو اس کے سوال کے کسی حصّہ کا بھی جواب نہ ہوا، کیونکہ اس کا اعتراض نفس روایات اور ذریعہ روایت کے متعلق تھا کہ وہ مشتبہ ہے اس لئے قرآن کی غیر مشتبہ آیات میں فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔

علاوہ بریں حکمت کا مفہوم جو انہوں نے حدیث کو قرار دیا کسی طرح صحیح نہیں۔ حکمت ایک عام لفظ ہے جس کے معنی ہیں، دانائی کی باتیں۔ خود قرآن کی صفت بھی حکیم ہے۔ یعنی اس میں حکمت کی باتیں ہیں جیسا کہ جا بجا آیات میں تصریح ہے۔

وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (۴/۱۱۳)

اور اللہ نے تجھ پر کتاب و حکمت نازل کی۔

سورۂ بنی اسرائیل میں تورات کے احکامِ عشرہ کے مقابل تیرہ احکام نازل کرنے کے بعد اللہ نے

فرمایا۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ (۱۷/۳۹)

یہ حکمت کی ان باتوں میں ہے جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہے۔

خود اس منکر نے اعتراض کیا تھا کہ ازواجِ رسولؐ کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ

وَاذۡكُرۡنَ مَا يُتۡلٰى فِىۡ بُيُوۡتِكُنَّ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالۡحِكۡمَةِ (۳۳/۳۴)

اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں جو تلاوت کی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔

جس سے معلوم ہوا کہ حکمت قرآن میں شامل ہے ورنہ حدیثوں کی کون تلاوت کرتا ہے[1]۔ مگر امام صاحب نے اس کی طرف توجہ نہ فرمائی، حالانکہ خود ان کا قول ہے کہ حدیثیں منزل من اللہ نہیں ہیں بلکہ استنباطِ نبویہ ہیں۔ یعنی قرآنی آیات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سمجھا اور فرمایا[2]۔ پھر جس حکمت کا منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو وہ حدیث کیسے ہو سکتی ہے؟ قرآن میں ہے کہ "ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی"۔ کیا لقمان کو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں دی گئی تھیں۔

دوسری آیت "مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوۡلُ" (۵۹/۷) جو انہوں نے پیش کی، اور ان کی تقلید میں آج تک علماء حدیث پیش کرتے چلے آتے ہیں۔ وہ مالِ فئ و غنیمت بلا جنگ، کی تقسیم کے بارے میں ہے حدیث سے اس کا دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہاں "اٰتیٰ" کے لفظ کو جو "نھیٰ" کے بالمقابل واقعہ ہے، لوگوں نے غلط فہمی سے أَمَرَ یا قَالَ کے معنی میں سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ لفظ قرآن میں سینکڑوں جگہ آیا ہے اور کہیں ان معنوں میں مستعمل نہیں ہوا ہے، بلکہ ہر جگہ اس کے معنی "اعطا" یعنی "دینے" ہی کے ہیں۔ لہٰذا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔

تیسری دلیل بعض حضرات کی یہ ہے کہ سورۃ النجم میں ہے۔

---

[1] اسی بنا پر حدیثوں کے لئے "وحیٔ غیر متلو" کی اصطلاح وضع کی گئی تھی۔ یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ واضح رہے کہ وحی کی اقسام (متلو اور غیر متلو) کا کوئی سراغ عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہؓ میں نہیں ملتا۔ یہ سب زمانۂ بعد کی اختراعات ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

[2] اتقان فی علوم القرآن، مصنف علامہ جلال الدین سیوطی۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳/۳-۴)

رسول اپنے نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ وحی ہے جو اس پر اتاری جاتی ہے۔

لہٰذا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو نکلتا تھا سب وحی تھا۔ لیکن یہ استدلال حقیقت فہمی سے بہت دُور ہے کیونکہ یہاں ذکر ہے اس کلام کا جو بذریعہ وحی کے اترتا تھا اور جس سے کفار کو انکار تھا اور وہ صرف قرآن تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانگی امور میں ازواج مطہرات سے یا عام معاملات میں دوسرے لوگوں سے رات دن جو گفتگو فرماتے تھے، اس کے وحی ہونے کا نہ دعوے تھا نہ اس کے متعلق کوئی بحث تھی۔ مخالفت صرف قرآن کی تھی اور وہی بذریعہ وحی کے نازل کیا گیا تھا جس کی تصریح اس میں ہے۔

وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۚ (۶/۱۹)

اور میری طرف یہ قرآن اتارا گیا ہے کہ میں تم کو اس کے ذریعہ سے آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے۔

دوسری جگہ ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ (۲۱/۴۵)

کہہ دے کہ میں تم کو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں۔

حصر ہے کہ سرمایۂ انذار صرف قرآن ہے اور وہی لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے وحی کیا گیا ہے۔ اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا اور لوگوں کو یاد کرایا۔

بعض لوگوں نے وحی کی دو قسمیں کر ڈالی ہیں۔ متلو اور غیر متلو یا جلی و خفی۔ ایک کو قرآن کہتے ہیں، ایک کو حدیث۔ لیکن یہ ان کی محض خیالی اصطلاح ہے جس کو قرآن سے کوئی سروکار نہیں۔ حدیثیں بھی اگر وحی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن کی طرح لکھوایا کیوں نہیں؟

چوتھی دلیل جو بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کی جاتی ہے، یہ ہے کہ بیسیوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ رسولؐ کا حکم دیا ہے۔ اگر حدیثیں دینی حجت نہ ہوں تو یہ اطاعت کس طرح ہوگی؟ دراصل یہی سب سے بڑی غلط فہمی ہے جو حدیثوں کو دین بنانے کا موجب ہوتی ہے۔ میں نے اس مبحث پر ایک مفصل مقالہ "اسلامی نظام" کے عنوان سے لکھ دیا ہے جو شائع ہو چکا ہے اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں[1]۔ یہاں مختصراً صرف اس قدر لکھنا ضروری

[1] اس کا ملخص باب اول میں دیا جا چکا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔

(۱) پیغمبری :- یعنی پیغاماتِ الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔ اس حیثیت سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپؐ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔ یہ پیغمبری آپؐ کی ذات پر ختم ہو گئی۔

(۲) امامت :- یعنی امت کا انتظام، اس کو قرآن کے مطابق چلانا۔ اس کی شیرازہ بندی، ان کے باہمی قضایا کے فیصلے، تدبیر مہمات اور جنگ و صلح جیسے اجتماعی امور پر ان کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ۔ اس حیثیت سے آپؐ کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم کی گئی۔

یہ امامتِ کبریٰ جو آپؐ کی ذات سے بنی نوعِ انسان کی صلاح و فلاح کے لئے قائم ہوئی، قیامت تک مستمر ہے جو آپؐ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے سے ہمیشہ رہنی چاہیئے۔ قرآن میں اطاعتِ رسولؐ کے جو احکام ہیں آپؐ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ منصبِ امامت کے لئے ہیں جس میں آپؐ کے آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں۔ ان کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت ہے اور رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسولؐ کی اطاعت　　　　کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد امامِ وقت یعنی مرکزِ ملت کی اطاعت ہے۔ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم امت میں موجود تھے۔ ان کی اطاعت اللہ و رسولؐ کی اطاعت تھی (اور یہ اُمت ہمیشہ آپؐ ہی کی اُمت رہے گی۔ کیونکہ آپؐ کے اوپر ایمان لائی ہے) اور آپؐ کے بعد آپؐ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسولؐ کی اطاعت ہوگی۔ رسولؐ کی اطاعت یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے بعد جو کوئی ان کے نام سے کچھ کہہ دے ہم اس کی تعمیل کرنے لگیں۔ یہ ذہنیت اُمت میں اس وقت پیدا ہوئی جب کوئی صحیح خلیفۂ رسولؐ نہیں رہا اور مستبدوں نے مرکز پر تغلب حاصل کر کے اُمت کو اپنا غلام بنا لیا اور دینی قیادت چھوڑ دی جو علماء اور رواۃ حدیث نے لے لی، اسی دن سے اُمت مذہبی انفرادیت اور انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ ورنہ دین کی ضروریات قرآن کے اتباع اور امامتِ وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں۔ امام کے ساتھ امت کے منتخب افراد ہوں گے جن کی مشاورت سے وہ اس کو حسبِ اقتضائے زمانہ قرآن کے مطابق چلائے گا اور اس میں وحدتِ مرکزی قائم رکھے گا اور متفرق نہ ہونے دے گا۔

یہاں سے واضح کر دینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو قرآن کا مخاطب قرار دیا ہے، وہ انسانی عقل ہے جس میں اس نے فکر و نظر کی قوت ودیعت فرمائی ہے، اس کی ہدایت کے لئے جس قدر روشنی کی ضرورت ہے اس کتاب میں رکھ دی ہے جو ہر زمان و مکان میں اس کی رہنمائی کے لئے کافی ہے اور کسی ماحول کے ساتھ خصوصیت

نہیں رکھتی، بخلاف روایات کے جو ماضی کے ساتھ وابستہ کر دیتی ہیں۔

قرآن نورِ مبین اور مفصل کتاب ہے جس کو اس کے اوّلین مخاطب یعنی صحابہ کرامؓ بے تکلف سمجھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے الفاظ و معانی کی تشریح کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔ کل زمانۂ نبوت میں قرآنی تعلیمات کے متعلق صحابہؓ نے جس قدر باتیں پوچھیں، وہ امام رازی کے بیان کے مطابق ۱۴، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں صرف ۱۲ ہیں۔ ان سب کے جوابات قرآن ہی میں نازل کیے گئے۔ جو علامہ سیوطیؒ کی اتقان میں نیز مختصر جامع بیان العلم کے آخری صفحہ میں ایک ایک کر کے گنا دیئے گئے ہیں۔ بلکہ ہر شخص قرآن میں یسئلونك اور یستفتونك کے الفاظ سے خود بھی ان کو شمار کر سکتا ہے۔

قرآن وحدیث

اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن ہی کو ایمانی کتاب قرار دیا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ (۲/۲۸۵)

ایمان لایا رسول اس پر جو اس کی طرف اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین بھی۔

اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو اسی کتاب پر ایمان رکھنے کی ہدایت کی ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا (۲/۱۳۶)

کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اتاری گئی۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ (۴۲/۱۵)

اور کہہ دے کہ میں ایمان لایا اس کتاب پر جو اللہ نے اتاری۔

اس قسم کی آیات اس کثرت سے ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور سارے قرآن میں کتاب اللہ کے سوا کسی حدیث پر ایمان لانے کا حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت نکلتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ (۳۱/۶)

اور بعض آدمی وہ ہیں جو "حدیث" کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ

سے بلاعلم (یقین) کے بھٹکا دیں۔ اور اس کو مذاق بنالیں۔ یہ ہیں جن کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

آیت میں "حدیث" کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) اس سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

(۲) اس کی بنیاد علم یعنی یقین پر نہیں ہے۔

(۳) اس سے لوگ اللہ کی راہ یعنی دین کو مذاق بناتے ہیں۔

اس لئے جن لوگوں نے اس لفظ کی تفسیر غنا یعنی راگ کے ساتھ کی ہے، ان کا قول صحیح نہیں ہے، کیونکہ راگ سے غرض نشاط و طرب ہوتی ہے نہ کہ گمراہ کرنا، یا اللہ کی راہ کو مذاق بنانا اور نہ اس کو علم یعنی یقین سے کوئی تعلق ہے۔ یہ صرف قصص و روایات ہیں جو اس کے ذیل میں آتے ہیں۔

جس طرح قرآنی ہی ایمانی کتاب ہے، اسی طرح وہی دستور العمل بھی ہے اور اسی کی پیروی کا حکم ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۶/۱۰۶)

پیروی کر اس کی جو تیری طرف رب کے پاس سے وحی کی گئی۔

اور رسول کو اس کے اعلان کر دینے کی ہدایت ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (۷/۲۰۳)

کہہ دے کہ میں تو بس اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کے

پاس سے میری طرف وحی آتی ہے۔

اور امت کے لئے یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳)

اس کی پیروی کرو جو تمہاری طرف[1] تمہارے رب کے پاس سے اتارا گیا اور اس کے سوا

---

[1] یہ قرآن رسول کریمؐ کے توسط سے ساری امت کے لئے نازل ہوا۔ انا انزلنا الیك الکتب للناس بالحق (۳۹/۴۱) (ہم نے تیرے اوپر کتاب انسانوں کے لئے نازل کی ہے حق کے ساتھ)۔

اولیار کی پیروی نہ کرو۔

مرکز یعنی امام کو حکم دیا گیا کہ اسی کتاب کے ذریعہ سے لوگوں میں حکمرانی کرے۔

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے۔

اور جو کوئی کتاب کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ فاسق ہے۔

وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۵/۴۷)

اور جو لوگ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ فاسق ہیں۔

قرآن ہی کی تبلیغ رسولؐ کا فریضہ قرار دی گئی۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (۵/۶۷)

اے رسول! جو کچھ تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو (لوگوں کو) پہنچا دے اور اگر تو نے (یہ) نہ کیا تو اس کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی۔

یہی قرآن سرمایۂ انذار ہے۔

وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ (۶/۱۹)

اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا کہ اس کے ذریعہ سے تم کو آگاہ کروں اور ان کو بھی بھی جن تک یہ پہنچے۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۫ (۲۱/۴۵)

کہہ دے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے تم کو آگاہ کرتا ہوں۔

الغرض یہی نورِ مبین یعنی قرآن کریم ہے جس کی روشنی میں نبی خود چلتا تھا اور سب کو چلاتا تھا۔ اس آفتابِ حقیقت نے اس کے افقِ قلب پر طلوع ہو کر اس کو سراجِ منیر بنایا تھا۔ یہی اس کا سامانِ تعلیم و تبلیغ اور سرمایۂ بشارت و انذار تھا اور اسی سے وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا، یعنی ان کو کفر و شرک کی ظلمت سے نکال کر اسلام اور ایمان کی روشنی میں لاتا تھا۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴/۱)

عظیم الشان کتاب ہم نے تیری طرف اتاری ہے کہ تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لائے۔

اور اسی کے ذریعے سے جملہ امور قضایا کے فیصلے کرتا تھا۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتَٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ اللَّهُ (۴/۱۰۵)

ہم نے تیری طرف کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ جو اللہ تجھ کو سمجھائے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرے۔

یہی کتاب سرتاسر یقینی ہے۔

ذَٰلِكَ الْكِتَٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ (۲/۲)

یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں ہے۔

دین میں غیر یقینی چیزوں کی پیروی ممنوع قرار دے دی۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِۦ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔولًا (۱۷/۳۶)

جس چیز کا تجھ کو یقین نہیں اس کے پیچھے نہ چل۔ کان، آنکھ اور دل ہر ایک سے باز پرس ہوگی۔

اور ظنی امور کے متعلق فرمایا۔

إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِى مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا (۵۳/۲۸)

ظن حق کی جگہ کام نہیں دیتا۔

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِى الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ (۶/۱۱۶)

رُوئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تو ان کی بات مانے گا تو وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں۔

یہود نے اپنے احبار کی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے اعتماد پر وہ کہتے تھے کہ دوزخ ہم کو چند دنوں سے زیادہ نہیں

جلا سکا. قرآن نے کہا.

وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۳/۲۴)

ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے ان باتوں نے جن کو وہ اپنے دین میں گھڑتے تھے.

عقل اور حدیث

عقل کی رُو سے دیکھا جائے تو حدیثوں کی دینی حیثیت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ بسلسلہ سند مروی ہیں. مثلاً میں نے سُنا زید سے اس نے عمر سے، اس نے بکر سے، اس نے خالد سے، اس نے اصغر سے، اس نے اکبر سے الخ ایسا بیان جو اتنے واسطوں سے آئے، نہ شہادت ہے نہ علم ہے اور سوائے ظن کے یقین کے درجہ تک نہیں پہنچتا. کیونکہ اگر ایک شخص جس سے میں واقف ہوں، مجھ سے کوئی بات بیان کرے تو میں اس خیال کے مطابق جو اس شخص کی بابت میرے دل میں ہے. اس کی بات کے سچ یا جھوٹ ہونے کا فیصلہ اپنے قیاس سے کر سکتا ہوں لیکن جب اس نے کہا کہ میں نے اس کو زید سے سُنا ہے تو میرے پاس، کہ میں زید سے واقف نہیں ہوں، کوئی معیار اس کے جانچنے کا نہیں رہا. اب خود اپنے اس اعتماد کے مطابق جو زید کے متعلق وہ رکھتا ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ لگا سکتا ہے اور جب اس نے یہ کہا کہ زید نے اس کو عمر سے سنا تھا تو اب اس کے پاس بھی کوئی کسوٹی نہیں رہ گئی، اس لئے ایسے اقوال جو بسلسلۂ سند مروی ہیں، قائل یا سامع کسی کے لئے بھی حجت نہیں ہو سکتے. زیادہ سے زیادہ ان کی بابت یہی کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کے واسطہ سے یہ مروی ہیں، وہ معتبر لوگ تھے. لیکن یہ اعتماد بھی میرا اور قائل کا نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد ان بیانات پر ہے جو اس کے راویوں کے ہم عصروں کے ہیں، اس لئے یہ اعتماد ایک تاریخی چیز ہے. اس تاریخی بنیاد پر سوائے تاریخ کے، دین کی تعمیر نہیں ہو سکتی کیونکہ تاریخ ظن پر قائم ہوتی ہے. مگر دین یقین کا طالب ہوتا ہے جو روایات میں بجز متواتر کے نایاب ہے اور متواتر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ جملہ حدیثیں خبر واحد ہی ہیں، جن کے متعلق علماء اصول کا اتفاق ہے کہ وہ صحیح ہونے کی صورت میں یقین کے درجہ تک نہیں پہنچتیں. امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی اصول کی بہترین کتاب المستصفیٰ، جلد اوّل، صفحہ ۱۴۵ میں لکھتے ہیں.

خبر الواحد لا يفيد العلم

خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی.

خبر واحد سے کیا مراد ہے؟ اسے بھی اسی صفحہ میں دیکھئے.

انا نريد بخبر الواحد فى هذا المقام مالا ينتهى من الاخبار الى حد التواتر المفيد للعلم فما نقله جماعة من خمسة اوستةٍ مثلاً فهو خبر الواحد.

اس مقام پر خبرِ واحد سے ہماری مراد وہ حدیث ہے کہ حدِ تواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہنچے۔ مثلاً ایک حدیث جس کو کوئی جماعت پانچ یا چھ راویوں سے روایت کرتی ہو خبرِ واحد ہے۔

پانچ یا چھ تو مثال کے طور پر کہا جاتا ہے جب تک کوئی روایت، تواتر کی چاروں شرطیں جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں، پوری نہ کرتی ہو، خواہ وہ سینکڑوں راویوں سے کیوں نہ مروی ہو' غیر متواتر اور خبرِ واحد ہی رہے گی۔

حدیث کی بابت ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس کی تدوین کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہوا جبکہ بنی امیہ نے مسلمانوں کو غلام بنالیا تھا۔ اس کے کل مجموعے جو آج اُمت کے ہاتھوں میں ہیں' ان میں سے کوئی بھی اس سے قبل کا نہیں ہے' بلکہ صحاحِ ستہ یعنی حدیث کی چھ کتابیں جو اہلِ سنت میں مقبول ہیں' تیسری صدی ہجری کی مرتب کی ہوئی ہیں اور بنی اُمیہ کے عہد میں چونکہ خلفاء نے دینی قیادت چھوڑ دی تھی اور وہ محدثوں اور راویانِ حدیث کے ہاتھوں میں آگئی' اس وجہ سے امت میں ان کی عظمت و شان قائم ہو گئی تھی جس کو دیکھ کر ہزاروں دنیاداروں نے روایت کو بطور پیشہ کے اختیار کر لیا تھا اور جمہور میں مقبول اور محترم ہو گئے تھے۔ ان میں سے مختلف طبقات نے اپنے اپنے اغراض سے وضعی حدیثیں بنائیں اور امت میں ان کو پھیلایا۔ بعد میں جو ائمہ حدیث ان کی تنقید کے لئے کھڑے ہوئے' ان کے پاس سوائے لوگوں کے بیانات اور اپنے قیاس کے کوئی ایسا معیار نہ تھا' جس سے کھری کھوٹی حدیثوں کو پرکھ کر الگ الگ کر سکتے۔ اس وجہ سے ان کی صحیح قرار دی ہوئی حدیثیں بھی مشتبہ رہیں۔ چنانچہ غیر مسلم معترضین اسلام پر جس قدر اعتراضات کرتے ہیں' ان میں سے اکثر کی بنیاد ان حدیثوں پر ہوتی ہے جن کو مسلمانوں نے صحیح سمجھ کر تسلیم کر لیا ہے مگر اصل میں وہ موضوع ہیں۔ یہی سبب ہے ائمہ حدیث نے تصریح کی ہے کہ حدیث کے معاملہ میں حسنِ ظن جائز نہیں ہے بلکہ ان کا جانچنا اور پرکھنا ضروری ہے' کیونکہ حدیث خبر ہے۔ جس میں صدق اور کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے خود اس کی تنقید میں کوششیں کیں۔ اس سے بداہتہً ظاہر ہو جاتا ہے کہ حدیثیں علمی تنقید کے تحت میں ہیں اور ان کا درجہ دینی نہیں ہے۔ کیونکہ دینی امور یقینی اور تنقید سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اللہ نے رسولوں پر ایمان لانے کا اس وجہ سے حکم دیا ہے

کہ اس کے بعد ان کے لائے ہوئے پیغامات میں شک واقعہ نہ ہو سکے۔ بخلاف اس کے راویانِ حدیث پر ایمان لانے کا کوئی حکم نہیں ہے جو ان کی روایات کی تصدیق ضروری ہو۔ روایات تو کیا خود ہزاروں راوی ایسے ہیں کہ جن کو اگر ایک سچا کہتا ہے تو دوسرا جھوٹا کہتا ہے اور ہم کسی کی گرفت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تنقید میں ہر شخص اپنے ضمیر کی آواز میں آزاد ہے۔ اس وجہ سے روایات کی تنقید علمی ہے اور ان کا درجہ تاریخی ہے۔ وہ دینی حجت نہیں ہو سکتیں۔

رُتبہ حدیث

گذشتہ ابواب پر نظر ڈالنے سے حسبِ ذیل امور نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔

۱۔ حدیثیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیز خلفائے راشدینؓ کی مرضی کے خلاف رواج پذیر ہوئیں، کیونکہ حضور اکرمؐ نے تاکید کی تھی، کہ مجھ سے روایتیں کرنے سے بچو اور خلفائے راشدینؓ مسلسل کوشش کرتے رہے کہ اس کو یک قلم روک دیں۔

۲۔ حدیثوں کی کتابت کا بھی یہی حال ہے۔ آنحضرتؐ نے تصریحاً ان کے لکھنے کی ممانعت فرمائی اور خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ برابر اس کے نوشتوں کو مٹاتے اور جلاتے اور اُمّت کو فتنۂ کتابت سے روکتے رہے۔

۳۔ حدیثوں کی تصحیح و تضعیف بھی ظن و تخمین پر مبنی ہے، کیونکہ ائمۂ جرح و تعدیل کے پاس سوائے لوگوں کے بیانات کے اور اپنے قیاس کے کوئی ایسا معیار نہ تھا جس سے صحیح اور ضعیف روایات میں یقینی امتیاز قائم کر سکتے، اس لئے ان کی صحیح قرار دادہ حدیثیں بھی ظنّی ہیں۔ ان کے اصول کے مطابق کسی روایت کو صحیح کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "گمان غالب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا ہوگا" نہ کہ قطعی یقین۔ جیسا کہ مُلّا علی قاری نے اپنی کتاب "الموضوعات" میں تصریح کی ہے۔

> یہ (حدیثوں کی صحت) تمام تر وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آئی ہے۔
> ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انہوں نے صحیح کہا ہے وہ
> نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

پھر یہ صحیح قرار دی ہوئی حدیثیں بھی بالمعنی روایت کی گئی ہیں جس کی وجہ سے ان میں بے حد اختلافات ہیں۔ ان کو

دین مان لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت میں سینکڑوں فرقے بن گئے اور ملت کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ سنیوں کی حدیثیں الگ ہیں اور شیعوں کی الگ۔ ہر ایک فرقے نے اپنے مذہب کی تعمیر اپنے حسبِ منشا روایات سے کی ہے وہ صرف اپنی حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسروں کی حدیثوں کو غلط۔ اور فرقہ بندی قرآنِ کریم کی رُو سے شرک ہے۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ۔ الآیہ (۳۲-۳۰/۳۱)

اور مشرکین میں سے نہ ہو' یعنی ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفریق ڈال دی۔

بے شک آیاتِ قرآن کے معنی سمجھنے میں بھی اختلافات ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ اختلافات چونکہ الفاظ و عبارات کے نہ ہوں گے بلکہ صرف فہم کے ہوں گے۔ اس لئے مزید غور و فکر سے مٹ جائیں گے اور ان سے فرقہ بندی نہ ہو سکے گی۔

الغرض حدیث کا صحیح مقام دینی تاریخ کا ہے اس سے تاریخی فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن دین میں حجت کے طور پر وہ نہیں پیش کی جا سکتی۔ اس کو دین بنا لینے سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ قرآن کریم جو سراسر زندگی ہے' حجاب میں آگیا ہے۔ چنانچہ محدثین میں شروع سے لے کر آج تک جو اہم اور معرکتہ الآرا امور زیرِ بحث رہے ہیں' بالعموم اس قسم کے ہیں' جن کا ملت کی صلاح و فلاح اور اجتماعی زندگی سے کوئی عملی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ افضل ہیں یا حضرت علیؓ؟ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ سمار دنیا پر کس طرح نزول فرماتا ہے؟ قیامِ نماز میں ہاتھوں کو باندھنا چاہیئے یا نہیں؟ کیا امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا ضروری ہے؟ آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ؟ وغیرہ وغیرہ ــــ بخلاف اس کے اگر قرآن پر مدار رہتا تو اس نوعیت کے مسائل پیشِ نظر رہتے کہ مرکز کو قوی اور صالح العمل کیونکر رکھا جائے؟ قرآنی ہدایت کو عام کرنے اور جملہ انسانی برادری کو نجات اور سعادت کے راستے پر لانے کے کیا وسائل ہیں؟ کائناتِ فطرت جس کی نسبت قرآن نے کہا ہے کہ انسان کے لئے مسخر کی گئی ہے اس کی مخفی قوتوں کو کن تدابیر سے قابو میں لا کر انسانی خدمت میں لگایا جا سکتا ہے؟ ایمان اور عملِ صالح کو کن ذرائع سے ایسا فروغ دیا جائے کہ ملت کا ہر فرد صحیح "خلیفہ فی الارض" ہو سکے جس کے لئے اس کی تکوین ہوئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

وضع حدیث

(علامہ محمد اسلم جیراجپوری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بار بار تاکید کے ساتھ فرمایا تھا کہ "جو شخص میرے اوپر قصداً[1] جھوٹ بولے وہ جہنّم کو اپنا ٹھکانا بنالے۔" یہ حدیث اتنے صحابہ سے مروی ہے کہ بعض ائمہ حدیث نے اس کے متواتر ہونے کا دعوے کیا ہے۔ لیکن باوجود اس وعید کے بھی ایسے لوگ تھے جو اُسی زمانے سے جھوٹی حدیثیں گھڑنے لگے۔ مُلّا علی قاری نے موضوعاتِ کبیر میں امام طبرانی کی اوسط اور ابنِ عدی کی کامل کے حوالے سے لکھا ہے کہ مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر حیّ بنی لیث میں کسی شخص نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا، جس کو اس عورت کے سرپرستوں نے نامنظور کر دیا۔ وہ شخص حلّہ نبوی کے مشابہ ایک لباس پہن کر وہاں گیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے یہ حلّہ عطا فرمایا ہے، اور اختیار دیا ہے کہ میں تمہاری عورتوں کے بارے میں جو چاہوں حکم دوں۔ ان لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان سر آنکھوں پر۔ یہ کہہ کر اس کو ایک مکان میں ٹھہرایا اور اپنے دو آدمی تصدیق کے لئے دربارِ رسالت میں بھیجے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم یہ سُن کر بہت برہم ہوئے اور ایک انصاری کو حکم دیا کہ جا کر اس کو قتل کر کے آگ میں جلا دو۔ جب وہ انصاری پہنچے تو دیکھا کہ سانپ کے کاٹ لینے سے وہ مر چکا تھا۔ انہوں نے اس کی لاش کو آگ میں جلا دیا اور واپس چلے گئے۔

شیخ طاہر جزائری اپنی کتاب توجیہ النظر الی اصول الاثر کے صفحہ ۲۴۹ پر لکھتے ہیں:-

---

[1] بعض کے نزدیک اس روایت میں "قصداً" کا لفظ بعد کا اضافہ ہے۔ (طلوعِ اسلام)

وقد كذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو حيٌّ و وقد كان فى عصر الصحابة منافقون و مرتدون۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی زندگی ہی میں جھوٹ بولا گیا اور زمانہ صحابہؓ میں منافقین و مرتدین تھے۔

عہدِ صحابہؓ صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ:

لا تكتبوا عنى غير القرآن و من كتب عنى شيئًا غيره فليمحه۔

مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو اس کو مٹا ڈالے۔

علماء نے اس کی توجیہہ یہ لکھی ہے کہ قرآن کی حفاظت کے لئے یہ حکم دیا کہ کوئی دوسری چیز اس کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے۔ لیکن درحقیقت یہ وجہ نہ تھی۔ ورنہ آپ یہ حکم دیتے کہ قرآن کو الگ لکھو اور روایتوں کو الگ۔ بلکہ مقصد اس ممانعت کا یہ تھا کہ لوگ روایات میں نہ پڑ جائیں، کیونکہ جب روایات کا سلسلہ چلتا ہے تو سچ کے ساتھ جھوٹ بھی پھیلنے لگتا ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ اوّل ہی کے عہد میں لوگ روایتوں میں اختلاف کرنے لگے اور جب انہوں نے دیکھا تو لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ آج تم روایات میں اختلاف کرتے ہو، ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ کرو۔[1]

حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجموعہ احادیث بھی لکھا تھا جس میں تقریباً پانچ سو حدیثیں تھیں مگر آخر میں اس کو حضرت عائشہؓ سے لے کر آگ میں جلا دیا، کیونکہ ان کو خیال ہوا کہ ممکن ہے میں نے کسی کو معتبر سمجھ کر کوئی روایت اس سے لکھ دی ہو اور درحقیقت وہ معتبر نہ ہو۔[2]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ذکر ابی بکر۔

[2] تذکرۃ الحفاظ۔ (یہ روایت پہلے بھی درج کی جا چکی ہیں)۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس مجموعہ میں جملہ حدیثیں ایسی تھیں کہ انہوں نے لوگوں سے سُن کر لکھی تھیں، کیوں کہ وہ خود دربارِ رسالت کے رکنِ رکین تھے اور اپنے کان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنتے تھے جن میں ان کو شبہ کی گنجائش نہ تھی. لیکن چونکہ روایات میں اختلاف اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور امت کو بہ حیثیت خلیفۂ رسول ہونے کے انہوں نے اس سے روک دیا تھا، اس لئے خود بھی پسند نہ کیا کہ روایات کا مجموعہ چھوڑ جائیں.

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہؓ بن عمرو بن عاص نے بھی کچھ فرمودۂ نبویؐ اپنے پاس لکھ رکھا تھا. لیکن یہ مجموعہ بھی کسی کو نہ ملا. معلوم نہیں کہ ضائع ہوگیا یا انہوں نے بھی حضرت ابوبکرؓ کی طرح اس کو جلا دیا.

ساری آفت منافقوں کی وجہ سے تھی، جو سنتے کچھ تھے اور بیان کچھ کرتے تھے. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عہدِ صحابہؓ میں منافقین کے ساتھ مرتدین کی بھی جماعت تھی. اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ صدیق نے روایتِ حدیث کی ممانعت کی اور بعض بعض معتمد صحابہ نے جو روائتیں کیں، ان پر شہادت طلب فرمائی. حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد میں اور بھی سختی کی اور لوگوں کو روایت میں پڑنے سے منع فرمایا. اگر کوئی روایت بیان کرتا تو جب تک اس کے گواہ نہ لے لیتے نہ چھوڑتے. لیکن باوجود اس کے روائتیں پھیلیں اور کچھ لوگ اگر سچی روائتیں بیان کرنے والے تھے تو کچھ ایسے بھی تھے جو جھوٹ گھڑنے لگے. چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ بشیر بن کعب نے حضرت ابنِ عباسؓ کے سامنے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں. انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا. بشیر نے کہا کہ بات کیا ہے. جو آپ میری حدیثیں نہیں سنتے. فرمایا کہ کبھی وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بیان کرتا تو ہم جھپٹ کر اس کی طرف بڑھتے اور کان لگا کر سنتے. مگر جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب و یابس روائتیں شروع کیں اس وقت سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا.

یہی وجہ تھی کہ اکثر صحابۂ کبار رضوان اللہ علیہم نے حدیثیں بیان کرنی چھوڑ دی تھیں. حضرت زید بن ارقم سے ابنِ ابی لیلےٰ نے کہا کہ کوئی حدیثِ رسول سنائیے. انہوں نے کہا کہ ہم بوڑھے ہوگئے اور بھول گئے۔ حضرت زبیرؓ سے ان کے بیٹے عبداللہؓ نے فرمائش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کیجئے. انہوں نے بھی اسی طرح کا جواب دیا. صائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں حضرت سعد بن مالک کے ساتھ مدینہ سے مکہ گیا مگر ایک روایت بھی نہ سنی. امام شعبی کا بیان ہے کہ میں حضرت ابنِ عمرؓ کی خدمت میں ایک سال تک

رہا۔ لیکن انہوں نے کوئی حدیث بیان نہ کی۔

زمانۂ مابعد

عہدِ صحابہؓ کے بعد سے کذّابین اور وضّاعینِ حدیث کی کثرت بڑھتی گئی۔ علامہ ابن جوزی کے بیان کے مطابق اس کے اسباب حسبِ ذیل تھے:۔

۱۔ بعض لوگوں نے جن پر زہد غالب تھا، حفظ میں غفلت کی اور کچھ کا کچھ بیان کرنے لگے۔

۲۔ بعض اہلِ علم کی یادداشتیں ضائع ہو گئیں اور انہوں نے مجبوراً حافظہ سے روایت کی اور جو خیال میں آیا کہہ گئے۔

۳۔ بہت سے ثقہ راویوں نے بھی جن کی عقلوں نے بڑھاپے میں جواب دے دیا تھا، غلط روائتیں کیں۔

۴۔ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے سہواً غلط روایت کی اور بعد میں باوجود اپنی غلطی کے علم کے بھی اس سے رجوع کرنا خلافِ شان سمجھا۔

۵۔ زنادقہ نے شریعت کو مٹانے کے لئے جھوٹی حدیثیں گھڑیں۔

۶۔ جب مذہبی تفریق پیدا ہو گئی اور سُنّی اور شیعہ، خارجی، قدری، جہمی، مرجیہ اور معتزلہ وغیرہ فرقے بن گئے، اس وقت ہر ایک فرقہ کے لوگوں نے دوسروں کے مقابلہ کے لئے اپنی اپنی تائید میں حدیثیں وضع کیں۔

۷۔ بہت سے عابد اور زاہد لوگ ایسے تھے کہ عوام کو کسی اچھے کام کی رغبت دلانے اور بُرے کام سے ڈرانے کے لئے حدیثیں گھڑتے تھے۔ ابنِ جوزی کے بیان کے مطابق یہ لوگ شریعت کو نامکمل سمجھتے تھے جن کی تکمیل ان روایات سے کرتے تھے۔

۸۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ ہر پسندیدہ قول کے لئے اسناد ترتیب دے لینا اور اس کو رسول اللہؐ تک پہنچا دینا جائز ہے۔

۹۔ سلاطین کے مقربین اور حاشیہ نشین ان کے حسبِ منشا روائتیں گھڑتے اور ان کو اپنے تقرب کا ذریعہ بناتے تھے۔

۱۰۔ قصہ گو، واعظ اور مذکر طرح طرح کے افسانوں کو آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کرتے تھے، کیونکہ ان کی گرم بازاری کا سرمایہ یہی تھا۔

یہ وہ دس وجوہ ہیں جن کے باعث مکذوب و مجہول روایتیں مسلمانوں میں پھیلیں لیکن ان سب سے بڑھ کر سیاسی جماعتوں نے جو دین کی راہ سے عوام کے قلوب کو مسخّر کرنا چاہتی تھیں، حدیثیں بنائیں اور مشرق سے مغرب تک ان کو پھیلایا اور ان سے بھی زیادہ ان لوگوں نے جو اپنے علم اور تقدّس کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر بھٹانا چاہتے تھے، نئی نئی حدیثیں وضع کیں.

شیخ محمد طاہر گجراتی اپنی کتاب تذکرۃ الموضوعات میں لکھتے ہیں کہ ایک محدّث نے آخر عمر میں توبہ کی. اس وقت اس نے لوگوں سے کہا کہ ذرا دیکھ بھال کر حدیثوں کو قبول کیا کرو. کیونکہ ہم لوگ جب کسی بات کو اپنے حسبِ منشاء دیکھتے تھے تو اس کو حدیث بنا لیتے تھے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کر دیتے تھے).

اور کچھ لوگ علی الاعلان مکذوب روایتیں بیان کرتے تھے. کوئی تو اپنی گرمیٔ بازار کے لئے اور کوئی ثواب اور جہاد سمجھ کر. چنانچہ نوح بن ابی مریم نے قرآن کی ایک سورۃ کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں جن کو مفسّرین اور خاص کر بیضاوی نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے. جب ائمہ حدیث نے ان کی تحقیق شروع کی تو اس نے اقرار کیا کہ میں نے یہ حدیثیں خود بنائی ہیں تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں. یہی حال اکثر ان رواۃ کا تھا جنہوں نے ترغیب و ترہیب کی حدیثیں روایت کی ہیں.

واعظین اور قصہ گو تو نہایت بے باکی اور جرأت سے کام لیتے تھے.

(اس کے بعد علامہ مرحوم نے واعظوں کے وہ قصّے بیان کئے ہیں جن میں وہ وضعی حدیثوں سے کام لیتے تھے. چونکہ یہ واقعات سابقہ مضامین میں آچکے ہیں اس لئے ہم نے انہیں حذف کر دیا ہے. ازاں بعد انہوں نے کتاب الضعفاء کی فہرست لکھی ہے. یہ بھی پہلے گزر چکی ہے. پھر تحریر فرماتے ہیں).

جب وضّاعین کی اس قدر کثرت تھی کہ ان کے تراجم بارہ بارہ جلدوں میں لکھے گئے تو ظاہر ہے کہ موضوع احادیث کی کس قدر کثرت ہوئی ہوگی.

کثرتِ موضوعات

عقیلی کا قول ملّا علی قاری نے موضوعات کبیر میں نقل کیا ہے کہ زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں. تذکرۃ الموضوعات میں شیخ محمد طاہر گجراتی لکھتے ہیں کہ جو نبازی، ابنِ عکاشہ اور محمد بن تمیم فارابی نے دس ہزار سے زیادہ حدیثیں بنائیں. ابنِ ابی العوجاء کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب اس کو قتل کرنے کے لئے لے گئے تو اس نے کہا کہ میں نے چار

ہزار حدیثیں وضع کی ہیں، جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتا رہا ہوں۔

روایات کا تو کیا ذکر ہے۔ بعض بعض وضاعین نے پوری پوری کتابیں روایات کی تصنیف کر ڈالیں جو اوّل سے آخر تک غلط تھیں۔ "تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۸ میں ہے:

"کتبِ حدیث میں بعض کتابیں ایسی ہیں کہ ان کی جملہ روایات موضوع ہیں۔ منجملہ ان کے القضاعی کی کتاب ہے۔ پھر اربعون ودعانیہ۔ ان دونوں میں سے ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔" وصایا علی" نامی کتاب میں بھی بجز پہلی حدیث کے باقی سب غلط ہیں۔ انس بصری کی مسند جو تین سو حدیثوں کا مجموعہ ہے سرتاسر غلط ہے۔ ابن عدی نے لکھا ہے کہ موسیٰ بن جعفر نے اپنے آباء کی روایت سے جو حضرت علیؓ تک پہنچائی گئی تھی ایک کتاب نکالی جو ہزار حدیثوں کا مجموعہ تھی۔ اس کی تمام حدیثیں سُن کر دارقطنی نے کہا کہ یہ کتاب "علویات" جھوٹ اور افتراء کا مجموعہ ہے۔ اللہ اس کے واضع پر لعنت کرے۔ اس نے جماع اور طریقۂ جماع کے متعلق بھی حضرت علیؓ کے نام سے وصیتیں روایت کی ہیں۔ دیلمی نے لکھا ہے کہ ابو الفضل جعفر بن محمد حسینی کی کتاب العروس منکر اور غیر معتبر ہے۔ اور امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق بن ابراہیم نے اپنے باپ اور دادا کی روایت سے ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جو ہرگز اس قابل نہیں کہ اس سے حجت پکڑی جائے۔

کُتبِ موضوعات

جب احادیث کی پڑتال شروع کی گئی، اس وقت ائمہ جرح وتعدیل نے جہاں کذابوں کا پتہ لگانے کی کوشش کی وہاں ان کی روائتیں بھی چھانٹ کر نکالتے گئے۔ اور جو ان کے نزدیک حتمی طور پر موضوع ثابت ہو گئیں، ان کے مجموعے تیار کر دیئے۔ ان میں جو کتابیں مشہور ہیں وہ ذیل میں درج کرتا ہوں:

کتاب الاباطیل	ابو عبداللہ الحسین ہمدانی متوفی ۵۴۲ھ
الموضوعات الکبریٰ	ابوالفرج عبدالرحمٰن بن جوزی۔ متوفی ۵۹۷ھ

	(چار جلدوں میں ہے)	
مختصر الموضوعات	امام سفارینی۔	
اللالی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ۔	جلال الدین سیوطی۔	
تذکرۃ الموضوعات۔	شیخ محمد طاہر، گجرات پاک پٹن کے مشہور ہندی محدث۔ مقتول ۹۸۶ھ	
رسالتان فی الموضوعات۔	رضی الدین صنعانی متوفی ۶۵۲ھ۔	
الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ	شیخ ابو اللہ محمد شامی متوفی ۹۴۲ھ۔ امام شوکانی یمنی متوفی ۱۲۵۵ھ۔	
کتاب المغنی	حافظ ضیاء الدین موصلی متوفی ۶۲۳ھ	
الموضوعات الصریحہ۔	عمر بن بدر۔	
الکشف الالٰہی۔	محمد سندروسی متوفی ۱۱۷۷ھ۔	
تذکرۃ الموضوعات۔	ملّا علی قاری۔ متوفی ۱۰۱۴ھ۔	
اللولوء المرصوع۔	محمد بن خلیل قاوقجی۔ متوفی ۱۳۰۵ھ۔	

ان وضاعین اور موضوعات سے حدیث پر ایسی آفت آئی جس کا اندازہ مشکل ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات ایک تھی اور حدیثیں بھی جو آپ سے روایت کی گئی ہیں، ان کا ۹۹ فیصدی حصہ مدنی زندگی سے متعلق ہے جس کی کل مدت دس سال ہے اور ادھر وضاعین و کذابین کی ایک بے شمار فوج ہو گئی جو دن رات حدیثیں گھڑنے میں لگی رہتی تھی۔ بلکہ ان میں سے بعض کا پیشہ یہی تھا۔ ان ہزاروں ہزار وضاعین نے لاکھوں حدیثیں وضع کر ڈالیں اور ان کو پھیلا دیا۔ اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں جو تھوڑی سی حدیثیں بلاشبہ صحیح تھیں اس طرح مخلوط ہو گئیں کہ بڑے بڑے نقادوں کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ اس دریائے کذب سے سچائی کے قطروں کو چن سکیں۔

تنقیدِ حدیث

ائمہ حدیث نے جب حدیثوں کو پرکھنا شروع کیا اور صحیح اور غلط کو الگ الگ کرنے لگے۔ اس وقت دو چیزوں کو سامنے رکھا۔ ایک خود حدیث کو اور دوسرے رُواۃ کو۔

موضوع حدیث کی شناخت کے لئے انہوں نے حسبِ ذیل اصول قرار دیئے:

۱. صحیح تاریخ کے خلاف ہو.
۲. رافضی صحابہ کے یا خارجی اہلِ بیت کے مطاعن میں روایت کرے.
۳. حدیث میں ایسا واقعہ ذکر کیا جائے جس کے بیان کرنے والے بہت سے ہو سکتے ہوں مگر صرف ایک ہی شخص روایت کرتا ہو.
۴. قرآن کے خلاف ہو.
۵. عقلِ صحیح کے خلاف ہو.
۶. چھوٹے چھوٹے عمل پر بڑے بڑے اجر کا وعدہ یا چھوٹے چھوٹے گناہ پر بڑے بڑے، عذاب کی وعید ہو.
۷. قرینہ یا موقع کے خلاف معلوم ہوتی ہو۔

لیکن ان اصولوں سے صرف تھوڑی سی غلط اور موضوع حدیثیں پکڑی جا سکتی ہیں. کیونکہ جو لوگ جھوٹی حدیثیں تراشتے تھے، وہ اس کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیتے تھے تاکہ کوئی گرفت نہ کر سکے. چنانچہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود بڑے بڑے قانون دانوں کی جرح کے بھی جھوٹے گواہ اپنی شہادتوں میں پورے اتر جاتے ہیں. اور کبھی کبھی سچے گواہوں سے زیادہ قابلِ اعتبار قرار پا جاتے ہیں. لہٰذا یہ اصول جو غلط روایتوں کی پہچان کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، تقریباً بے کار ہیں. یہی وجہ تھی کہ ائمہ جرح و تعدیل نے دوسری چیز یعنی رواۃ کی ثقاہت پر زیادہ دارو مدار رکھا. لیکن مشکل یہ ہے کہ ثقاہت ایک باطنی وصف ہے. اس کی تمیز کی بنیاد کس امر پر رکھی جائے. رہا ظاہری تقوٰے اور طہارت تو اس کی بابت خود محدثین کا تجربہ بہت تلخ ہے. یحییٰ بن سعید القطان جو جرح و تعدیل کے عظیم الشان امام ہیں، کہتے ہیں کہ اہلِ صلاح و خیر سے زیادہ حدیث کے معاملہ میں کوئی جھوٹا نہیں ہوتا. امام مسلم کا قول ہے کہ اہلِ خیر کی زبان سے بلا ارادہ بھی جھوٹ نکلتا ہے.

ایوب سختیانی نے اپنے ایک پڑوسی کے علم، زُہد، عبادت و طہارت کی بہت تعریف کی، مگر اس کے بعد کہا کہ اگر وہ میرے سامنے ایک کھجور کے بارے میں بھی کوئی شہادت دے تو میں قبول نہیں کروں گا۔[۱]

---

[۱] توجیہہ النظر، صفحہ ۲۵۔

اس لئے مجبوراً رواۃ کی صداقت، ثقاہت اور عدالت کا مدار شہرت اور مقبولیت پر رکھا گیا۔ یعنی ان لوگوں کی روایت لی جائے جن کی ثقاہت اہلِ علم میں مقبول اور مشہور ہو۔

حدیثیں حضرت عمر بن عبد العزیز کے حکم سے دوسری صدی ہجری کے آغاز سے کتابوں میں لکھی جانے لگیں۔ گو اس وقت بھی لوگ جانچ کرتے تھے۔ مگر اصل تنقیدِ حدیث کا زمانہ تیسری صدی ہے۔ بیشتر ائمہ جرح وتعدیل[1] اسی عہد میں ہوئے۔ ان ائمہ میں بھی تسامح موجود تھا۔ تذکرۃ الموضوعات میں ہے:

هذا كله يظهر للمحدثين من حيث نظرهم الى الاسناد والافلا مطمع للقطع لتجويز العقل ان يكون الصحيح فى نفس الامر موضوعًا والموضوع صحيحًا۔

یہ سب کچھ وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انہوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

چنانچہ جملہ اصولیین اور ائمہ حدیث نے صحیح سے صحیح حدیث کی صحت کو بھی ظنی مانا ہے، یقینی نہیں کہا ہے بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے[2]۔ انہوں نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں۔ مثلاً قوی، صحیح، حسن، مقبول یا ضعیف، موضوع، منکر اور مردود۔ ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ورنہ روایت کی تو صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، صحیح یا غلط۔

غرض حدیث کی جو تنقید ہوئی ہے، اس میں ابھی بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے۔ علامہ ابن جوزی نے جو حدیث میں کسی قدر متشدد تھے، اپنی کتاب الموضاعات الکبریٰ میں سننِ اربعہ کی بہت سی حدیثوں بلکہ صحیحین یعنی بخاری اور مسلم کی بھی متعدد حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے۔ علماء نے رفع امان کے خیال سے ان کی تردید کی لیکن دلیل بجز اس کے اور کچھ نہ دی کہ یہ مسلّم چلی آتی ہے۔

حافظ ابن حجر جو باوجود اس کے کہ حدیث میں بہت نرم ہیں، لکھتے ہیں کہ ابن جوزی نے بھی اس قدر

[1] مثلاً احمد بن حنبل، یحییٰ ابن معین، علی بن المدینی، امام بخاری، مسلم اور اربابِ سنن وغیرہ۔
[2] شیخ طاہر جزائری لکھتے ہیں کہ وہ حدیثیں جن کو متواتر کہا گیا ہے ان میں تو صرف تواتر معنوی ہے۔

موضوعات چھوڑ دی ہیں کہ ان کی کتاب کے برابر (یعنی چار جلد کی) ایک دوسری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

موضوعات کا اثر

اگرچہ ائمہ محدثین نے ان مکذوبات سے امت کو بچانے کی کوشش کی، لیکن اس کا تسلط دلوں پر اس قدر ہوگیا تھا کہ آج تک ہزاروں موضوع حدیثیں مسلمانوں کا دینی سرمایہ بنی ہوئی ہیں اور ان کے عقائد و اعمال میں دخیل ہیں۔

یوں تو باب الطہارت سے لے کر باب الحشر والنشر اور باب الجنۃ والنار تک ایک بھی ایسا نہیں ہے جس میں موضوعات نہ ہوں لیکن بعض ابواب ایسے ہیں کہ ان میں صرف موضوعات ہی ہیں یا انہیں کی کثرت ہے مثلاً :

صلوٰۃ التسبیح۔	ایک حدیث بھی صحیح نہیں
صلوٰۃ حاجت۔	" " " "
صلوٰۃ الفیہ۔	" " " "

تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ بعض صوفیانہ کتابوں مثلاً ابوطالب مکیؒ کی "قوت القلوب" یا "ثعلبی" وغیرہ کی تفسیروں سے جنہوں نے غلط فہمی سے نصف شعبان کی رات کو شبِ قدر کہہ دیا، لوگوں نے اس میں صلوٰۃ الفیہ جاری کی۔ اور دس دس کی ٹولیوں میں سو سو رکعتیں پڑھنی شروع کیں اور عید سے بھی زیادہ شبِ برات کا اہتمام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس نے میلہ کی شکل اختیار کر لی جس میں اس قدر فسق و فجور ہونے لگا کہ اولیاء اللہ بیابانوں میں نکل جاتے تھے، اس خوف سے کہ کہیں اللہ کا قہر نہ نازل ہو جائے۔ سب سے پہلے اس کا رواج بیت المقدس میں ۴۴۸ھ میں ہوا۔ پھر سارے شام اور مصر میں پھیل گیا۔ آخر میں علمائے مصلحین نے توجہ کی جن کی کوشش سے یہ بدعت مٹ گئی۔ تاہم اس کا سلسلہ کچھ نہ کچھ آٹھویں صدی ہجری تک رہا۔ شیخ علی بن ابراہیم نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ شب برات میں روشنی کی ابتدا، برامکہ سے ہوئی جو مجوسیت چھوڑ کر اسلام لائے تھے، انہوں نے دینِ اسلام کی راہ سے اپنی آتش پرستی کی رسم کو تازہ کیا۔ اسی نے رفتہ رفتہ آتش بازی کی شکل اختیار کر لی جو مغرب سے مشرق تک پھیل گئی۔

زیارت قبرِ نبی	ایک حدیث صحیح نہیں۔

فضائلِ ائمہ اربعہ	ایک حدیث صحیح نہیں
فضائلِ عرب و زبانِ عربی۔	″ ″ ″ ″
مذمّتِ عجم و زبانِ عجمی۔	″ ″ ″ ″
فضائلِ ابدال واَوتاد و قطب و غوث۔	″ ″ ″ ″

صوفیہ کی کل مشہور حدیثیں موضوعات کی فہرست میں داخل ہیں مثلاً:۔

کنت کنزًا مخفیًا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق۔ من عرف نفسهٗ فقد عرف ربهٗ۔ رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر۔ اعدٰی عدوّك نفسك التی بین جنبیك ذرة من اعمال الباطن خیر من الجبال الرواسی من اعمال الظاهر۔ القلب بیت الرب۔ إن الله سبعین حجابًا من نور۔ وغیرہ۔

علماء متکلمین کے فضائل میں بھی تمام حدیثیں ساختہ ہیں۔ مثلاً

علماء کی سیاہی شہداء کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔ ایک فقیہ شیطان کے لئے ہزار عابد سے گریزاں ترہے۔

علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ یا میری امّت کے علماء بمنزلہ انبیاء بنی اسرائیل کے ہیں۔ جو شخص طلبِ علم کے لئے نکلتا ہے، فرشتے اس پر اور اس کے پاؤں کے نیچے اپنے پر بچھاتے ہیں۔

عالم کی طرف ایک نگاہ ڈالنا ساٹھ سال کے قیام اور صیام سے بہتر ہے۔

طلب العلم فریضة علی کل مسلم۔

العلم علمان، علم الادیان و علم الابدان۔ وغیرہ۔

فضائلِ صحابہ	اکثر حدیثیں موضوع ہیں۔
مناقبِ اہلِ بیت	″ ″ ″ ″
ہدیہ اور تحفہ کی فضیلت	″ ″ ″ ″

نکاح کی فضیلت اور عورتوں کی مدح۔	اکثر حدیثیں موضوع ہیں
فضائلِ درود	" " " "
مدائحِ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم۔	" " " "

مثلاً

لولاك لما خلقت الافلاك۔
كنت نبيا و آدم بين الماء والطين۔
انا مدينة العلم و عليٌّ بابها۔
انا افصح العرب والعجم۔

امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، مغازی، ملاحم اور تفسیر۔ ہر چند کہ علماء نے اس کی تاویل کی ہے لیکن فی نفسہٖ یہ قول کسی تاویل کا محتاج نہیں۔ چند حدیثیں ان ابواب میں اگر صحیح ثابت ہو گئیں تو مستثنیات میں ہیں۔

افتراقِ امّت کے متعلق جتنی حدیثیں ہیں موضوع ہیں۔ مثلاً "یہود و نصاریٰ کے ۷۲ فرقے ہوئے اور میری امّت کے ۷۳ ہوں گے جن میں سے صرف ایک جنّتی ہے۔" اس کی غلطی واقعتہً بھی ظاہر ہے۔ کیونکہ ۷۳ فرقے مسلمانوں کے چوتھی اور پانچویں ہی صدی ہجری میں علماء نے شمار کر دیئے تھے۔ اس کے بعد سے آج تک سینکڑوں فرقے بنے اور بنتے جا رہے ہیں۔

موضوع صحابہؓ اگرچہ ائمہ محدثین اور جملہ اہلِ تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ روئے زمین میں سب سے آخری صحابی جو رہ گئے تھے وہ حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ ہیں جنہوں نے مکّہ میں ۱۰۲ھ میں وفات پائی، مگر ان کذّابوں اور وضّاعوں نے زمانۂ مابعد میں بہت طویل العمر صحابہ مخترع کر لئے۔ منجملہ ان کے یہ لوگ ہیں۔

جبیر بن حرب: حافظ ابنِ حجر لکھتے ہیں کہ ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ غزوۂ خندق میں شریک تھے۔ امیر عبدالکریم بن نصر کا بیان ہے کہ میں نے امام ناصر کے ساتھ ۵۷۳ھ میں ان کی زیارت کی تھی۔

ابو عبداللہ محمد تقلی، پانچویں صدی ہجری میں تھے* ان کے بارے میں بیان کیا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے

مصافحہ کیا تھا۔ لوگ جاکر تبرکاً ان سے مصافحہ کرتے تھے۔

قیس بن تمیم، ان کی پیشانی پر ایک نشان تھا جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ حضرت علیؓ کے خچر نے لات ماری تھی۔ چھٹی صدی ہجری کے آغاز (یعنی ۵۱۷ھ) میں ان سے حدیثیں روایت کی جاتی تھیں۔ گیلان میں رہتے تھے۔

بابا رتن ہندی، متوفی ۶۳۲ھ۔ ان کی نسبت کہا جاتا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تقریب میں شریک تھے۔ ہندوستان میں رہتے تھے۔

ان زندہ صحابیوں کو کھڑا کرکے ان کے بیان سے طرح طرح کی روایتیں امت میں پھیلائی جاتی تھیں بعض لوگ سندِ عالی کے خیال سے ان ثلاثیات کو کتابوں میں درج کرتے تھے۔ علماء کی ذہنیت اس قدر جامد تھی کہ جب ائمہ حدیث ان خرافات کا انکار کرنے لگے تو بعض لوگوں نے ان کے ساتھ مجادلہ کیا۔ امام ذہبی نے بابا رتن کی جملہ روایتیں موضوعات میں شامل کیں۔ اس پر علامہ مجد الدین صاحب قاموس بگڑ بیٹھے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر نے جب ان خرافات کی تغلیط کی تو علامہ صفدی ان کی تردید کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

قرآنی آیات کی تفسیر

احادیث کی رُو سے

احادیث کی سب سے بڑی ضرورت یہ بتائی جاتی ہے کہ ان کے بغیر قرآن کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس کے لئے جو دلیل دی جاتی ہے وہ نظر بظاہر ایسی معقول اور محکم دکھائی دیتی ہے کہ اس کا ہر شخص قائل ہو جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی کسی آیت کی جو تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی کیا اس سے بہتر تفسیر کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے؟ لاریب! اس سے بہتر تفسیر کسی اور کی نہیں ہو سکتی لیکن سوال یہ ہے کہ آیات کی جو تفسیر احادیث میں مذکور ہے کیا وہ فی الواقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تفسیر ہے؟ آپ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے (نہ ہی اس جواب سے متفق ہو سکتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تفسیر نہیں ہو سکتی) جب تک آپ خود نہ دیکھ لیں کہ احادیث میں یہ تفسیر کس قسم کی آئی ہے۔ اس مقصد کے لئے ہم حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں سے چند ایک آیات کی تفسیر پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ خود اندازہ فرمالیجئے کہ کیا اس تفسیر کے متعلق کسی صورت میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تفسیر ہے؟

---

(۱) سورۂ احزاب کی ایک آیت میں کہا گیا ہے۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا .... (۳۳/۶۹) "اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ کو اذیت دی۔ سو اللہ نے اُسے اس سے بری کر دیا جو وہ کہتے تھے"۔

بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کو کس کس انداز سے ستاتے تھے، اس کی تفصیل قرآن کے متعدد مقامات

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل

میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰؑ جس ہمت اور کوشش سے انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر وادیٔ سینا کی آزاد فضاؤں میں لے کر آئے تھے، یہی ایک واقعہ ایسا تھا جس کے احساس سے انہیں عمر بھر حضرت موسیٰؑ کا شکر گزار ہونا چاہیئے تھا، لیکن اس کے خلاف ان کا ردِّ عمل یہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ سے برملا کہتے تھے کہ اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا........ (۷/۱۲۹) "تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبت میں رہے اور تمہارے آنے کے بعد بھی ہم ستائے گئے۔" اس کی تفصیل تورات میں ہے کہ جب بنی اسرائیل نے مصریوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تو حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ:۔

اذیت کی تفاصیل

کیا مصر میں قبروں کے لئے جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لے آیا ہے؟ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا۔ تو ہمیں مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں۔ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا۔　　　(خروج ۱۰ - ۱۴/۱۲)

سینا کے میدان میں انہیں من و سلویٰ جیسی غذا ملتی تھی۔ وہ اس پر بھی بگڑ بیٹھے اور حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے کہ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ...... (۲/۶۱) یہ کیا کہ ہر روز ایک ہی چیز کھانے کو ملتی چلی جائے؟ تورات میں ہے۔

اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس بیابان میں موسیٰؑ اور ہارونؑ پر جھنجھلائی اور بنی اسرائیل بولے کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے زمینِ مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے، مارے جاتے۔

(خروج ۱۳ - ۱۶/۱۱)

ذرا پانی کی قلت ہوئی تو بگڑ بیٹھے اور کہنے لگے کہ:۔

تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں اور ہمارے مویشیوں کو پیاس سے ہلاک کردے۔　　　(خروج ۱ - ۷/۳)

ایک وادی سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی بت کے سامنے سجدہ ریز ہیں تو حضرت موسیٰؑ کا

دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں بھی ایسا بُت بنوا دیجئے۔ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (۷/۱۳۸) حضرت موسیٰؑ چند دنوں کے لئے طور پر تشریف لے گئے تو انہوں نے گوسالہ کی پرستش شروع کر دی (۲۰/۸۶) ایک بستی میں داخلہ کے وقت ان سے تاکید کی گئی کہ اپنا انداز اس قسم کا رکھو۔ انہوں نے دانستہ اور عمداً اس کے خلاف کرنا شروع کر دیا (۵۹ - ۲/۵۸)۔ حضرت موسیٰؑ نے خدا پر ایمان کی تاکید کی تو جواباً کہنے لگے ۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (۲/۵۵) ہم تیری بات نہیں مانیں گے جب تک ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں؟ اللہ تعالےٰ نے انہیں ایک گائے ذبح کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے جس قدر بہانہ سازیاں کیں ان کی تفصیل سورۂ بقرہ میں موجود ہے۔ (دیکھئے ۲/۶۷)۔ حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ اللہ نے یہ ارضِ مقدس تمہارے نام لکھ دی ہے۔ اٹھو اور اس پر قبضہ کر لو۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ جب تک پہلے وہاں کے باشندے وہاں سے نکل نہ جائیں ہم اس طرف قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں ۔ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۵/۲۴) تم اور تمہارا ربّ جاؤ اور ان لوگوں سے جنگ کرو۔ جب اس طرح یہ لوگ وہاں سے نکل جائیں تو ہم آ جائیں گے۔ ہم یہاں بیٹھے انتظار کرتے ہیں۔

یہ تھی اس قوم کی روش جس سے تنگ آ کر حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا تھا کہ:

یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ .... (۶۱/۵)

اے میری قوم! تم مجھے اس طرح اذیت کیوں دیتے ہو؟ حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔

اور خدا سے فریاد کی تھی کہ:

رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۵/۲۵)

اے میرے ربّ! میں اپنی ذات اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ پس تو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں فیصلہ کر دے۔

بنی اسرائیل کے ان واقعات کو سامنے لا کر قرآن کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا تھا کہ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی ۔ تم بنی اسرائیل کی سی حرکتیں نہ کرنے لگ جانا۔ اس سے نبیؐ کا تو کچھ نہیں بگڑتا۔ قانونِ

خداوندی اسے ان تمام باتوں سے محفوظ رکھتا اور شرف و مجد کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ لیکن وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے جو اپنے رسول کی اطاعت کرنے کی بجائے اسے اس طرح ستاتی ہے۔

آپ قرآن کریم کی بیان کردہ تشریحات پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ ان کی روشنی میں آیتِ زیرِ نظر کا صحیح مفہوم کس طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ دیکھئے کہ احادیث میں اس آیت کی تفسیر کیا بیان ہوئی ہے۔ بخاری میں ہے:

بخاری کی تفسیر

ابو ہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ بنی اسرائیل برہنہ غسل کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا جاتا تھا اور موسیٰ علیہ السلام تنہا غسل کیا کرتے تھے تو بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ موسیٰؑ کو ہم لوگوں کے ہمراہ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ فتق میں مبتلا ہیں۔ ایک دن اتفاق سے موسیٰؑ غسل کرنے گئے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے بھاگا اور حضرت موسیٰؑ بھی اس کے تعاقب میں یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ "ثوبی یا حجر ثوبی یا حجر" (اے پتھر میرے کپڑے دے دے۔ اے پتھر میرے کپڑے دے دے)۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی طرف دیکھ لیا اور کہا کہ واللہ موسیٰؑ کو کچھ بیماری نہیں ہے (اور پتھر ٹھہر گیا) موسیٰؑ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم (حضرت موسیٰؑ) کی مار سے چھ یا سات نشان (اب تک باقی ہیں)۔" (بخاری جلد اوّل ص ۲۰۶)[1]

آپ اس تفسیر کو بار بار پڑھیئے اور سوچئے کہ کیا یہ رسول اللہؐ کی ارشاد فرمودہ تفسیر ہو سکتی ہے؟ اور دیکھئے۔

(۲) ترمذی میں حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جبریل کہتے تھے کہ جب فرعون غرق ہونے لگا اور ایمان لانا چاہتا تھا۔ کاش اس وقت اے محمدؐ تم مجھے دیکھتے کہ میں سمندر کی مٹی لئے ہوئے اس کے منہ میں ٹھونس رہا تھا کہ یہ کلمہ نہ پڑھ دے

---

[1] صحیح بخاری (باب مَنْ اِغْتَسَلَ عُرْیَانًا) حدیث نمبر ۲۷۳، باب ۱۹۳، شائع کردہ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور۔

اور اس پر اللہ کی رحمت نہ آجائے۔ (جامع ترمذی اردو جلد دوم صفحہ ۳۰۲ مطبوعہ دارالاشاعت اردو بازار کراچی)۔

اوّل تو یہ دیکھئے کہ کیا جبریل امینؑ کا یہ کام ہے کہ لوگ خدا پر ایمان لانا چاہیں اور ان کے مُنہ میں مٹی ٹھونسے کہ کہیں وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور اللہ ان پر اپنی رحمت نہ کر دے؟ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ قرآنِ کریم

فرعون کا ایمان لانا

میں فرشتوں کے متعلق ہے کہ: یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰)۔ فرشتے از خود کچھ نہیں کرتے۔ انہیں جو حکم خدا کی طرف سے ملتا ہے وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جبریل کا یہ فعل (کہ وہ سمندر کی مٹی فرعون کے مُنہ میں ٹھونس رہے تھے کہ وہ کہیں وہ کلمہ نہ پڑھ دے) خدا کے حکم سے تھا۔ لیکن قرآن میں یہ تصریح موجود ہے کہ فرعون نے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ
وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۱۰/۹۰)

فرعون نے کہا کہ میں ایمان لایا کہ کوئی الٰہ نہیں بجز اس الٰہ کے جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں اور میں مسلمان ہوں۔

یعنی اس روایت کے مطابق خدا کا منشاء یہ تھا کہ فرعون ایمان نہ لائے۔ اس منشاء کے پورا کرنے کے لئے اس نے جبریلؑ کو مامور کیا کہ وہ فرعون کے مُنہ میں مٹی ٹھونسے۔ لیکن وہ اس کے باوجود ایمان لے آیا اور یوں (معاذ اللہ) خدا کی تدبیر ناکام ہو گئی۔

آپ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ ہو گی؟

---

(۳) قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ (۵۷/۳) خدا زمان

هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ کی تفسیر

(TIME) کی قیود سے ماوراء ہے، یہ ایسی صاف اور واضح بات ہے جس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں — وہی اوّل ہے وہی آخر ہے — لیکن جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک طویل روایت آئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین سے آسمان پانچ سو سال کی راہ ہے۔

پھر ہر آسمان سے دوسرے آسمان تک بھی اسی قدر فاصلہ ہے۔ اور آسمان سات ہیں
جن کے اوپر عرش ہے اس کا فاصلہ بھی ساتویں آسمان سے پانچ سو سال کی راہ ہے،
اسی طرح اس زمین کے نیچے زمین ہے پانچ سو سال کی مسافت پر اور زمینیں بھی سات ہیں
جن میں سے ہر ایک سے دوسری کا فاصلہ اسی قدر ہے، قسم ہے اللہ کی جس کے ہاتھ میں
محمدؐ کی جان ہے اگر تم میں سے کوئی رسی زمین کے اسفل ترین طبقہ میں لٹکائے تو وہ ٹھیک اللہ
کے اوپر جا گرے گی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ھو الاول والاخر (الآیہ) (جامع ترمذی اردو جلد دوم صفحہ ۳۰۸ مطبوعہ دار الاشاعت اردو بازار کراچی)

آپ آیت کو دیکھئے اور پھر اس تفسیر پر غور کیجئے۔ کیا یہ تفسیر کسی صورت میں بھی رسول اللہ کی ارشاد فرمودہ ہو سکتی ہے؟

اسی (جامع ترمذی) میں حضرت عباسؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ؛

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ۷۱ یا ۷۲
یا ۷۳ سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی
قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے، اس کے
اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں
کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔ (جامع ترمذی اردو جلد دوم صفحہ ۲۰۳ مطبوعہ دار الاشاعت اردو بازار کراچی)۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں کہا گیا ہے کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی

تضاد

راہ پانچسو سال کی ہے۔ اور پھر (اسی جامع ترمذی میں) یہ کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی راہ ۷۱ یا ۷۲ یا ۷۳ سال کی ہے۔ یہ کتنا بڑا تضاد ہے!

یہ جو کہا گیا ہے کہ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے۔ اس سمندر میں سات پہاڑی بکرے ہیں،

كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ کی تفسیر

اور ان بکروں کی پشت پر خدا کا عرش ہے تو یہ غالباً قرآن کی اس آیت کی تفسیر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (۱۱/۷)۔ یہ آیت ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قرآن میں ہے۔ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱/۳۰) ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا۔ یعنی زندگی (LIFE) کی نمود بھی پانی سے ہوتی ہے اور اس کا مدار بھی پانی پر ہے۔ پانی کے بغیر زندگی کا امکان نہیں۔

حیات کا بنیادی ذریعہ پانی ہے اور کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ. پانی پر مرکزی کنٹرول خدا کا ہے. بالفاظِ دیگر حیات کے ذریعہ اور سرچشمہ پر خدا کا اقتدار و اختیار ہے.

یہ تو ہے وہ حقیقت جسے قرآن نے بیان کیا ہے. اور وہ ہے اس حقیقت کی وہ تفسیر جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا. آپ خود فیصلہ کیجئے کہ کیا اس تفسیر کو کسی صورت میں بھی نبیِٔ اکرمؐ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے؟

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ

(۴) سورۃ بقرہ میں "قصۂ آدم" کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۲/۳۱) اور خدا نے آدم کو تمام اسماء کا علم سکھایا" بات بالکل صاف ہے. آدم نوعِ انسانی کا تمثیلی ترجمان ہے. انسان کو خدا نے اس کی صلاحیت دی ہے کہ وہ اشیائے فطرت کا علم حاصل کرے. اسی سے وہ مسجودِ ملائک اور مخدومِ کائنات ہے. انسان کو خدا نے اختیار و ارادہ کے شرف سے بھی سرفراز کیا ہے. اختیار و ارادہ (CHOICE) کے لئے علم ضروری ہے. علم کے بغیر انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.

بخاری کی تفسیر

اب یہ دیکھئے کہ بخاری (کتاب التفسیر) میں اس آیت کی تفسیر میں کیا آیا ہے. لکھا ہے:

> حضرت انسؓ بن مالک رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن سب مسلمان جمع ہو کر مشورہ کریں گے کہ آج کے دن ہم کسی کو اپنا شفیع بنائیں اور آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپ سب کے باپ ہیں. آپ کو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے سجدہ کرایا ہے اور آپ کو تمام نام سکھائے ہیں. آپ ہماری شفاعت کریں تاکہ ہم آج اس جگہ کی تکلیف سے راحت پائیں. وہ کہیں گے کہ آج میں اس قابل نہیں اور اپنا گناہ یاد کریں گے (خلافِ حکم درخت کا پھل کھا لیا تھا) اور اللہ سے شرمائیں گے اور کہیں گے کہ تم نوحؑ کے پاس جاؤ. ان کو اللہ نے سب سے پہلا نبی بنا کر زمین پر بھیجا تھا. سب آدمی ان کے پاس آئیں گے. وہ کہیں گے کہ آج میں اس قابل نہیں. اور اپنا گناہ یاد کر کے شرمائیں گے اور کہیں گے. تم ابراہیمؑ خلیل اللہ کے پاس جاؤ. سب کے سب

ان کے پاس آئیں گے۔ یہ بھی ایسے ہی کہیں گے اور کہیں گے تم موسیٰؑ کے پاس جاؤ۔ اللہ نے ان سے باتیں کی ہیں اور توریت عطا فرمائی ہے۔ وہ ان کے پاس آئیں گے۔ یہ بھی کہیں گے میں آج کے دن تمہارا شفیع نہیں ہو سکتا اور اپنا گناہ یاد کر کے شرمائیں گے اور کہیں گے کہ عیسٰی علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ رسول اللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ جب ان کے پاس آئیں گے یہ بھی ایسے ہی کہہ دیں گے۔ اور کہیں گے محمدؐ کے پاس جاؤ جس کے اللہ نے اگلے پچھلے سارے گناہ بخش دیئے ہیں۔ وہ اس وقت میرے پاس آئیں گے۔ میں ان کو اللہ کے پاس بخشوانے لے جاؤں گا۔ اور اللہ کے حضور میں (داخلہ کی) اجازت طلب کروں گا تو مجھ کو (آنے کی) اجازت ملے گی تو جس وقت میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو سجدے میں گر پڑوں گا۔ اور اللہ جو بات میرے دل میں ڈالے گا وہ کہوں گا۔ پھر (اللہ کی طرف سے) کہا جائے گا کہ (اے محمدؐ) سر کو اٹھا اور سوال کر تاکہ عطا کیا جائے اور کہہ، تیرا کہا سُنا جائے گا اور شفاعت کر، قبول کی جائے گی۔ اس وقت میں سر اٹھاؤں گا اور جیسے اللہ نے مجھے تعلیم دی تھی ویسے ہی اس کی تعریف بجالاؤں گا۔ پھر شفاعت کروں گا۔ اس وقت ایک گروہ بخشا جائے گا (یعنی مہاجرین و انصار اور بڑے بڑے نیک بندے، اولیاء اللہ، شہداء) اور ان کو جنت میں بھجوا دوں گا۔ پھر اللہ کی طرف آؤں گا اور دیکھ کر سجدے میں جاؤں گا اور شفاعت کروں گا۔ اس مرتبہ بھی ایک گروہ بخشا جائے گا۔ اسی طرح تیسری دفعہ اور چوتھی دفعہ شفاعت کروں گا۔ پھر اللہ سے کہوں گا کہ کوئی باقی نہیں رہا سوائے ان کے جن کو قرآن نے روکا ہے اور ان پر ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہنے کا حکم ہے (ابو عبداللہ بخاری کہتے ہیں) یعنی جن کے بارے میں یہ آیت "خالدین فیہا" ہے۔ (صحیح بخاری جلد دوم صفحہ نمبر ۷۷۴، ۷۷۵ اور ۷۷۶، حدیث نمبر ۸۵۱، باب نمبر ۵۶۳، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور)

پہلے تو دیکھئے کہ اس تفسیر میں (جسے رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے) تعلیم آدم کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں۔ پھر اس پر غور فرمایئے کہ اس میں مختلف انبیائے کرامؑ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے اس قدر شرمندہ ہوں گے کہ خدا کے سامنے جانے کی جرأت نہ کریں گے۔ کیا اس قسم کی باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو سکتی ہیں؟

(۵) سورۂ بقرہ میں ہے کہ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (۲/۲۲۳)

تمہاری بیویاں کھیتی ہیں

"تمہاری بیویاں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں. تم جب چاہو اپنی کھیتی میں آؤ"[1] بات صاف ہے کہ بیویوں کے پاس جانے کا مقصد تخم ریزی ہے تاکہ اس سے افزائشِ نسل ہو. اس کے لئے جس طرح کسان مناسب موقعوں پر کاشتکاری کرتا ہے تم بھی موزوں موقعہ پر تخم کاری کرو. اس کی تفسیر میں (بخاری کتاب التفسیر میں) حسبِ ذیل روایت آئی ہے:۔

اس کی تفسیر

نافع مولیٰ ابنِ عمرؓ سے مروی ہے کہ عبداللہ ابنِ عمر قرآن پڑھتے میں کسی سے کلام نہیں کرتے تھے. ایک روز قرآن پڑھتے میں میں ان کے پاس چلا گیا. جب وہ سورۂ بقرہ پڑھتے ہوئے اس آیت (نساءُکُم) پر پہنچے تو مجھ سے کہا کہ تجھے معلوم ہے یہ آیت کب نازل ہوئی. میں نے کہا مجھے معلوم نہیں. انہوں نے اس کا شانِ نزول بیان کیا اور پھر آگے پڑھنے لگے. عبدالصمد کہتے ہیں ابنِ عمر سے یہ بھی روایت پہنچی ہے کہ بعض آدمی عورتوں سے اغلام کرتے تھے. ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی. جابرؓ سے روایت ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی عورت سے اُلٹا لٹا کر جماع کرے اس کی اولاد بھینگی ہوگی. اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ قول غلط ہے. عورتوں سے جس ہیئت سے چاہو جماع کرو. (صحیح بخاری مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور، جلد دوم، صفحہ ۹۷، باب نمبر ۱۰۶، حدیث نمبر ۱۴۳۲)

یہ ہے بخاری کی حدیث. علامہ بدر الدین عینی اور حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے بخاری کی شرحیں لکھی ہیں. انہوں نے اس حدیث کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے آپ اسے بھی ملاحظہ فرمالیں.

اس حدیث کی تشریح

علامہ عینی نے پہلے بخاری کی حدیث یوں نقل فرمائی ہے:۔

باب قوله تعالیٰ نسائكم حرث لكم فأتوا حرثكم انّٰى شئتم وقدموا لانفسكم. الآيۃ. حدثنا

---

[1] اس آیت کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں پس تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ" لیکن اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تم اپنی کھیتی میں جب چاہو آؤ".

اسحٰق قال اخبرنا النضر بن شمیل قال اخبرنا ابن عون عن نافع قال کان ابن عمر اذا قرء القرآن لم یتکلم حتی یفرغ منہ فاخذت علیہ یومًا فقراء سورۃ البقرہ حتی انتھی الیٰ مکان قال اتدری فیما انزلت قلت لا قال نزلت فی کذا ثم مضٰی و عن عبد الصمد قال حدثنی ابی قال حدثنی ایوب عن نافع عن ابنِ عمر فاتوا حرثکم انی شئتم قال یاتیھا فی .... رواہ محمد بن یحیٰی ابن سعید عن ابیہ عن عبید اللہ عن نافع ابن عمر

حق تعالےٰ کے اس قول کا باب کہ نساءُکم حرث لکم فاتو حرثکم انی شئتم و قدموا لانفسکم۔ الآیہ۔

ہم سے اسحٰق نے بیان کیا کہ ہمیں نضر بن شمیل نے خبر دی کہ ہمیں ابنِ عون نے نافع سے خبر دی کہ ابنِ عمرؓ جب قرآن پڑھا کرتے تھے فارغ ہونے تک نہیں بولتے تھے۔ میں ایک روز قرآنِ کریم لے کران کے پاس بیٹھا اور انہوں نے سورۂ بقرہ پڑھی۔ حتیٰ کہ کسی مقام تک پہنچے اور پوچھنے لگے۔ جانتے بھی ہو کس بارے میں نازل ہوئی تھی؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں تو ابن عمرؓ نے فرمایا: فلاں فلاں بارہ میں نازل ہوئی تھی۔ پھر آگے چل دیئے اور عبدالصمد سے مروی ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا کہ مجھ سے ایوب (سختیانی) نے بیان کیا نافع سے۔ انہوں نے ابن عمرؓ سے کہ فاتوا حرثکم انّی شئتم کی تفسیر ابن عمرؓ نے بیان کی کہ اپنی بیوی سے .... میں جماع کرے۔ اس کو محمد بن یحیٰی ابنِ سعید نے بھی بیان کیا ہے اپنے باپ سے انہوں نے عبید اللہ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے ابن عمرؓ سے۔ (صحیح بخاری مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور، جلد دوم، صفحہ ۷۹، حدیث نمبر ۱۶۲۴، باب نمبر ۱۰۱)

اس کے بعد علامہ عینی لکھتے ہیں۔

یہاں اصل کتاب (بخاری) میں خالی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ یعنی لفظ فی کے بعد۔ حمیدی نے

الجمع بین الصحیحین میں کہا ہے فی قبلہا۔ یعنی اپنی بیوی کی شرمگاہ میں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس روایت کو ابنِ جریر نے اپنی تفسیر میں ابو قلابۃ الرقاشی سے انہوں نے عبدالصمد بن عبدالوارث سے نقل کیا ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا اور وہاں انہوں نے یا تیہا فی الدبر (اپنی بیوی سے دُبر میں جماع کرے) لفظ سے بیان کیا ہے۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری للعلامۃ العینی مطبوعہ قاہرہ، حدیث نمبر ۱۶۲۴، باب نمبر ۶۰۱)

یہ رہی علامہ عینی کی شرح۔ اب حافظ ابنِ حجر عسقلانی کی شرح ملاحظہ کیجئے، وہ لکھتے ہیں:

دُبر میں جماع

ابن العربی نے سراج المرید میں نقل کیا ہے کہ بخاری نے اس حدیث کو تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اور کہا ہے۔ یا تیہا فی .... اور خالی جگہ چھوڑی ہے۔ اور یہ مسئلہ مشہور ہے۔ اس موضوع پر محمد بن شعبان نے ایک پوری کتاب تصنیف کی ہے اور محمد بن سحنون نے ایک جزو لکھا ہے اور ثابت کیا ہے ابنِ عمرؓ کی حدیث عورت سے دُبر میں مجامعت کرنے ہی کے بارے میں ہے۔ مازری نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کے اندر اختلاف ہے جو لوگ اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں، انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ اور جو لوگ اس کے حرام ہونے کے قائل ہیں وہ یہ کہہ کر اس سے الگ ہوگئے ہیں کہ یہ آیت اس سبب کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو جابرؓ کی حدیث میں آرہا ہے۔ یعنی یہودیوں پر ردّ کرنے کے لئے جیسا کہ دوسری حدیث میں آرہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ عموم جب کسی خاص سبب پر وارد ہوتا ہے تو بعض اصولیوں کے نزدیک وہ اسی پر محصور رہتا ہے اگرچہ اکثر اصولیوں کے نزدیک عموم لفظ کا اعتبار ہوا کرتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ یہ اصول اس بات کا مقتضی ہے کہ یہ آیت جواز میں حجت ہو۔ لیکن بہت سی حدیثیں اس کی ممانعت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ لہٰذا وہ حدیثیں آیت کے عموم کے لئے مختص ہوجائیں گی۔ اگرچہ عموم آیت کی کسی خبر واحد سے تخصیص کرنے کے بارے میں بھی علماء کے اندر اختلاف ہے اور ائمہ حدیث میں سے ایک بڑی جماعت اس طرف گئی ہے۔ جیسے امام بخاری، الذہلی، بزار، نسائی اور ابو علی نیشاپوری وغیرہ کی اس بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوتی۔ (فتح الباری شرح صحیح بخاری، مصنف حافظ ابنِ حجر عسقلانی، حدیث نمبر ۱۶۲۴، باب نمبر ۶۰۱)

یہاں سے آپ نے دیکھ لیا کہ حافظ ابنِ حجر کے نزدیک اس مسئلہ میں (کہ عورت سے دُبر میں جماع جائز ہے یا نہیں) اختلاف ہے۔ بعض اسے حرام قرار دیتے ہیں۔ بعض اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اب علامہ عینی کی مزید تصریح ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں:

امام مالکؒ کا مسلک

ابن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے کہ اس کو بہت بڑی جماعت نے کہا ہے۔ ان سب اقوال کو ابنِ شعبان نے اپنی کتاب "جماع النسواں" میں جمع کر دیا ہے اور اس کے جواز کو صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت کی طرف منسوب کیا ہے اور بہت سی روایتوں سے امام مالک کی طرف بھی نسبت کی ہے۔ اور ابو بکر الجصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن میں کہا ہے کہ امام مالکؒ سے اس کی اباحت مشہور ہے اور امام مالکؒ کے اصحاب اس کا انکار محض اس کی شناعت اور قبح کی وجہ سے کر دیتے ہیں۔ مگر امام مالکؒ کی یہ بات اس قدر مشہور ہے کہ ان لوگوں کے انکار سے اس کی نفی نہیں ہو سکتی۔

محمد بن سعد نے ابو سلیمان جوزجانی سے نقل کیا ہے کہ میں امام مالکؒ بن انس کی خدمت میں حاضر تھا۔ ان سے مجامعت فی الدُّبر کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارا اور فرمایا کہ ابھی ابھی تو میں اس سے غسل کر کے آرہا ہوں۔ ایسے ہی ابن القاسم نے ان سے نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ فرماتے تھے میں نے کسی ایسے آدمی کو نہیں پایا جس کی میں دین کے بارے میں پیروی اور اقتدار کر سکوں اور وہ اس کے حلال ہونے میں شک کرتا ہو۔ یعنی عورت سے اس کے دُبر میں جماع کرنے کے بارے میں۔ اس کے بعد امام مالکؒ نے یہ آیت پڑھی۔ نساءکم حرث لکم فأتوا حرثکم انّٰی شئتم۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز واضح ہوگی اور میں اس میں ذرا بھی شک نہیں کرتا۔ رہا امام شافعیؒ کا مذہب، اس بارے میں تو امام طحاویؒ نے فرمایا ہے کہ ہم سے محمد بن الحکم نے بیان کیا کہ انہوں نے امام شافعیؒ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے اس کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے اور قیاس یہ ہے کہ وہ حلال ہے۔

(عمدۃ القاری شرح بخاری العلامۃ العینیؒ حدیث نمبر ۴۱۹۳، باب نمبر ۶۰۱)

یعنی امام مالکؒ تو یقینی طور پر اس کے جواز کے قائل تھے اور خود اس پر عمل پیرا۔ اور امام شافعیؒ کا قیاس تھا کہ یہ حلال ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے اس باب میں امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے امام اعظمؒ کے ایک شاگرد امام محمدؒ سے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> امام حاکمؒ نے مناقبِ شافعیؒ میں ابن الحکم کے طریق سے نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ مشہور ہے جو اسی مسئلہ کے بارے میں امام شافعیؒ اور امام محمد بن الحسنؒ کے درمیان ہوا۔ ابن الحسنؒ نے امام شافعیؒ کے خلاف اس امر میں استدلال کیا کہ کھیتی تو فرج ہی میں ہو سکتی ہے تو امام شافعیؒ نے جواب میں کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرج کے علاوہ باقی سب کچھ حرام ہے۔ امام محمد بن الحسنؒ نے اس کو مان لیا کہ ہاں فرج کے علاوہ دوسرے مواقع حرام ہیں۔ اس پر امام شافعیؒ نے پوچھا مجھے بتاؤ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی پنڈلیوں کے درمیان یا اس کی کہنیوں کے درمیان مجامعت کرے تو کیا یہاں کھیتی ہو گی؟ امام محمدؒ نے کہا کہ نہیں ان جگہوں پر کھیتی نہیں ہو گی۔ امام شافعیؒ نے پوچھا کہ یہ حرام ہو گا؟ امام محمدؒ نے کہا کہ نہیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا۔ پھر تم جس بات کے خود قائل نہیں اس سے کس طرح استدلال کرتے ہو۔ امام حاکمؒ نے کہا کہ شاید امام شافعیؒ اپنے قولِ قدیم میں اس کے حلال ہونے کے قائل ہوں کیوں کہ اپنے قولِ جدید میں اس کے حرام ہونے کی انہوں نے تصریح کی ہے۔ (فتح الباری شرح صحیح بخاری، مصنف ابن حجر عسقلانی، حدیث نمبر ۱۶۲۴، باب نمبر ۱۰۱)

آپ نے قرآن کی آیت دیکھ لی۔ اس آیت کی تفسیر میں جو حدیث بخاری میں آئی ہیں انہیں بھی پڑھ لیا۔ اور اس حدیث کی شرح میں ہمارے ائمہ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ بھی آپ کی نظروں سے گذر چکا۔ اس کے بعد فیصلہ آپ خود فرمایئے کہ کیا اس تفسیر کو رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اور قرآن کو اس قسم کی حدیثوں کی رو سے سمجھا سکتا!

حلال کو حرام مت ٹھہراؤ

(۶) سورۂ مائدہ میں ہے —

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ ...... (۵/۸۷)

اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں کو جنہیں اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے، حرام نہ ٹھہراؤ۔

بات صاف ہے کہ دین میں خود ساختہ پابندیوں کی زنجیروں میں اپنے آپ کو مت جکڑو۔ پابندی انہی حدود کی ضروری ہے جنہیں خدا نے متعین کیا ہے۔ اب اس آیت کی وہ تفسیر دیکھئے جو بخاری (کتاب التفسیر) میں بیان ہوئی ہے۔ لکھا ہے:

بُخاری کی تفسیر

عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں جہاد میں شریک تھے اور ہمارے ساتھ عورتیں نہ تھیں۔ (اور عورتوں سے جدائی کی برداشت نہ ہوتی تھی بوجہ حرارت اور قوّت کے) تو ہم نے عرض کیا کہ آیا ہم خصی ہو جائیں۔ آپ نے منع فرمایا اور پھر اجازت دے دی کہ عورت سے تھوڑے یا زیادہ دن مقرر کرکے جس میں عورت راضی ہو نکاح کر لو (تاکہ اس فعل یعنی خصی ہونے سے بچو) اور نگاہِ بد کسی پر نہ پڑے اور پھر یہ آیت پڑھی۔ (صحیح بخاری جلد دوم، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور، صفحہ ۸۴۶، حدیث نمبر ۱۷۲۳، باب نمبر ۶۷۳)

متعہ کی اجازت

اس حدیث کی رُو سے، متعہ کی اجازت بھی مل گئی! بخاری (کتاب النکاح) میں ایک حدیث ہے کہ:

سلمہ بن اکوع کہتے ہیں کہ ہم ایک لشکر میں تھے (جو حنین پر گیا تھا) رسولؐ اللہ نے ہمارے پاس آکر ارشاد فرمایا کہ تمہیں متعہ کرنے کی اجازت ہے۔ تم متعہ کر لو۔

(۱) صحیح بخاری اُردو ترجمہ، جلد سوم، صفحہ ۶۵، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور، حدیث نمبر ۹۸، باب نمبر ۳۷۔)
(۲) صحیح مسلم مع شرح نووی اردو، جلد چہارم، صفحہ ۱۹، کتاب النکاح، شائع کردہ نعمانی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور)

دوسری روایت میں ہے:

سلمہ بن اکوع رسولؐ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ جو مرد اور عورت آپس میں موافق ہو جائیں تو تین شب تک باہمی عشرت کرنا جائز ہے۔ پھر اگر وہ زیادہ رہنا چاہیں اور کم کرنا تو وہ مختار ہیں۔ (ایضاً)

متعہ کی تفصیل

اس کی تفصیل میں صحیح مسلم کی ایک روایت بھی دیکھتے جائیے۔ لکھا ہے۔

سبرہ جہنی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے متعہ کی اجازت دی تو میں اور ایک اور شخص بنی عامر کی ایک عورت کے پاس اکٹھے گئے اور اس سے اپنی خواہش

کا اظہار کیا۔ اس نے اپنی اُجرت کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ میں اپنی چادر دوں گا۔ میرے ساتھی نے کہا کہ وہ بھی اپنی چادر دے گا۔ اس کی چادر میری چادر سے اچھی تھی۔ لیکن میں اس کی بہ نسبت جوان تھا، وہ عورت جب اس کی چادر کی طرف دیکھتی تھی تو اس کی طرف مائل ہوجاتی تھی۔ اور جب میری طرف دیکھتی تو مجھے پسند کرتی۔ بالآخر اس نے کہا کہ تم اور تمہاری چادر میرے لئے کافی ہے۔ چنانچہ تین روز تک میں اس کے پاس رہا۔" (صحیح مسلم مع شرح نووی اردو جلد چہارم ص۱

آپ خود فیصلہ کیجئے کہ کیا ان تفسیری روایات کو کسی صورت میں بھی حضور نبیِ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے؟

---

(۷) سورۂ مائدہ میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے کہیں گے کہ تم نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ وہ تجھے اور تمہاری والدہ کو معبود بنالیں؟ اس کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ کہیں گے کہ معاذ اللہ! میں ایسا کس طرح کہہ سکتا تھا۔ میں نے تو انہیں یہی تلقین کی تھی کہ وہ میرے اور اپنے رب ہی کو اپنا الٰہ مانیں۔ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ (۵/۱۱۷) جب تک میں ان میں رہا، میں ان کی نگرانی کرتا رہا (کہ وہ غلط راستہ اختیار نہ کریں) لیکن جب تو نے مجھے وفات دے دی تو پھر تو خود ان پر نگران تھا) میری عدم موجودگی میں جو کچھ انہوں نے کیا میں اس کا

صحابہؓ معاذ اللہ مُرتد ہوگئے

ذمہ دار نہیں۔ بات کس قدر واضح ہے لیکن اس آیت کی تفسیر میں (بخاری۔ کتاب التفسیر میں) جو حدیث بیان ہوئی ہے اسے ملاحظہ کیجئے۔ لکھا ہے:

> ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ خطبہ پڑھا کہ اے لوگو! تم اللہ کی طرف ننگے پیر، ننگے بدن، بلا ختنہ اٹھائے جاؤ گے۔ پھر آپ نے یہ آیت كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ (۲۱/۱۰۴) پڑھی (یعنی جیسے تمہیں پیدا کیا ہے، اسی حالت میں قیامت کے دن اٹھائیں گے بوجہ اس وعدے کے جو ہم نے کیا ہے۔ اس کام کے کرنے والے ہم ہیں)۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ سب سے پہلے ابراہیمؑ کو کپڑے پہنائے جائیں گے اور آگاہ ہو کہ چند آدمی میری امت کے

لائے جائیں گے اور فرشتے ان کو دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔ اس وقت میں کہوں گا۔ اے رب! یہ میرے صحابی ہیں۔ (اللہ کی جانب سے) ندا آئے گی تو نہیں جانتا انہوں نے تیرے بعد کیا کیا۔ اس وقت میں بھی عیسیٰؑ کی طرح سے کہوں گا (کُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا۔ (الآیہ) پھر اللہ کی جانب سے ندا ہو گی کہ یہ لوگ تیرے (محمدؐ کے) جدا ہونے کے بعد ہی مرتد ہو گئے تھے۔ (صحیح بخاری مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور جلد دوم ص۸۵، حدیث نمبر ۱۸۳۳، باب نمبر ۶۷۸)

یہ کچھ (معاذ اللہ) صحابہ کبارؓ کے متعلق کہا جا رہا ہے! کیا آپ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ ایسا کچھ رسول اللہ نے فرمایا ہوگا!

---

(۸) سورۂ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کی بتائی ہوئی خواب کی تعبیر بادشاہ نے سُنی تو وہ آپ کے

سیرتِ یوسفی

علم و بصیرت کا معترف ہو گیا اور اس نے حضرت یوسفؑ کو اپنے پاس بلا بھیجا۔

جیل خانے سے کون نہیں نکلنا چاہتا؟ پھر ان حالات میں جب کہ قیدی بے گناہ ہو اور اسے بادشاہ اعزاز و اکرام عطا کرنے کے لئے بلائے۔ عام حالات میں ہر شخص ایسے بلاوے کا لپک کر استقبال کرے گا لیکن نبی کا کردار اس سے بہت بلند ہوتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اس دعوت کے جواب میں قاصد سے کہا کہ میں یوں ترحمِ خسروانہ کی بنا پر جیل سے باہر آنا نہیں چاہتا۔ تم اپنے بادشاہ کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ کیا اس نے اس کی تحقیق کر لی ہے کہ جس مقدمہ میں مجھے ماخوذ کر کے سزا دی گئی تھی، اس کی اصل و حقیقت کیا تھی۔ اگر وہ مقدمہ کی ازسرِ نو تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ میں بے گناہ تھا، تو اُس صورت میں مَیں باہر آؤں گا۔ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ...... (۱۲/۵۰)

لیکن بُخاری کی روایت!

یہ ہے ایک نبی کا مقامِ بلند! لیکن اس کی تفسیر میں بخاری میں ہے کہ:

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر میں یوسف علیہ السلام کی طرح برسوں قید خانے میں رہتا، تو رہائی کے حکم کو ضرور قبول کر لیتا۔ (صحیح بخاری تفسیر سورت یوسف، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ جلد دوم صفحہ ۸۹۲، باب ۳۲۷، حدیث نمبر ۱۸۰۰)

یہ روایت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ کسی یہودی کی وضع کردہ ہے تاکہ اس سے اُن کے ایک نبی (حضرت

یوسفؑ) کا کردار بلند نظر آئے. اور اس کے مقابلہ میں نبیِ اکرمؐ کا مقام (معاذ اللہ) پست ہو جائے لیکن اسے منسوب رسولؐ اللہ کی طرف کیا گیا ہے.

اس قسم کی بے شمار روایات، صحاح ستّہ (حدیث کی چھ معتبر ترین کتابوں) سے پیش کی جا سکتی ہیں. لیکن ہمارا خیال ہے کہ انہی مثالوں سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ ہماری کتبِ احادیث میں کس قسم کی روایات درج ہیں. لیکن ہمارا قدامت پرست طبقہ اس پر مُصر ہے کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث تسلیم کیا جائے. آخر میں ہم جامع ترمذی کی ایک روایت نقل کر کے اس سلسلہ کو ختم کرتے ہیں. آپ سوچئے کہ کیا اس روایت کو دیکھ کر آپ کی نگاہیں اوپر اُٹھ سکتی ہیں؟ سورۂ حجر میں ہے:-

نگاہیں اُوپر نہیں اُٹھ سکتیں

وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ٥ وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۚ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ٥ (۱۵/۲۴-۲۵)

اور ہم اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں. اور تیرا رب انہیں اکٹھا کرے گا. وہ حکمت والا، علم والا ہے.

اس آیت کا مفہوم واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو پہلے ہو گزرے ہیں اور انہیں جو آنے والے ہیں، میدانِ حشر میں جمع کرے گا. اسی مفہوم کی ایک اور آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ ٥ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ٥ (۵۶/۴۹-۵۰)

کہہ دے کہ پہلے اور پچھلے ضرور متعینہ دن کی میعاد پر جمع کئے جائیں گے.

اب سنیئے کہ روایت کی رُو سے (سورۂ حجر کی ان آیات کی) تفسیر کیا ہے. جامع ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ:-

> ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسولؐ اللہ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی. صحابہ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اسے نہ دیکھیں. لیکن کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے کی طرف سے اُسے جھانکتے رہتے تھے. اس پر اللہ نے یہ

آیت اتاری کہ ہم تم میں اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی۔

(جامع ترمذی اُردو، جلد دوم، ص۳۰۹، مطبوعہ دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی)

ہم اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے ہیں۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ اس قسم کی روایات خود پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتیں۔ انہیں اسلام دشمنوں نے وضع کیا اور اس کی نسبت صحابہ کبارؓ اور حضور نبیِ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف کر دی۔ لیکن ہمارے مذہب پرست طبقہ کا اصرار ہے کہ انہیں نہ صرف صحیح ماننا ہوگا۔ بلکہ یہ بھی ماننا ہوگا کہ انہیں جبریل امین حضورؐ کی طرف لے کر نازل ہوا کرتے تھے۔ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ "کان جبریل ینزل بالقرآن والسنۃ ویعلمہ ایاھا کما یعلمہ القرآن" جبریل قرآن اور سنّت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنّت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔" (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، ص۶، از شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل السلفی)۔

گویا یہ روایات خدا کی طرف سے جبریل امین کی وساطت سے حضورؐ پر نازل ہوئی تھیں!

متعہ اور احادیث

شیعہ حضرات ایک مسئلہ کے قائل ہیں جسے متعہ کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی مرد اور عورت کا وقتی طور پر مباشرت کے لئے نکاح کر لینا۔ اور اس عورت کو اس جنسی تعلق کا معاوضہ دے دینا۔ اس وقتِ معینہ کے گزر جانے کے بعد (خواہ وہ ایک ہی مباشرت کے لئے ہو) "یہ نکاح" خود بخود فسخ ہو جاتا ہے۔ اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک متعہ جائز نہیں ہے۔

سنی اور شیعہ (یا مسلمانوں کے دوسرے فرقوں) کے متعلق ہمارا مسلک بالکل واضح ہے۔ قرآن بہ نصِ صریح فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے۔ جب رسول اللہ نے خالص قرآن کی بنیادوں پر دین کا نظام قائم فرمایا تھا تو امت میں کسی فرقے کا وجود نہ تھا۔ لہٰذا ہمارا تعلق کسی فرقے سے نہیں۔ بنا بریں اس مسئلہ میں بھی ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس باب میں سنی کیا کہتے ہیں اور شیعہ کیا، جس مقصد کے لئے ہم نے متعہ کا ذکر کیا ہے وہ کچھ اور ہے۔ ہم نے کہا یہ ہے کہ سنی حضرات متعہ کو ناجائز قرار دیتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک اس میں اور زنا میں صرف لفظی فرق ہے۔ حقیقت دونوں کی ایک ہے۔ لہٰذا سنی اس امر کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ متعہ کا حکم دے سکتے تھے، یا صحابہ کبارؓ متعہ کیا کرتے تھے۔

لیکن دیکھئے کہ خود سنیوں کے ہاں کے مستند احادیث کے مجموعے اور تفسیر کی کتابیں اس باب میں کیا کہتی ہیں۔ شیعہ حضرات کے مجتہد سید علی نقی صاحب کا تصنیف کردہ ایک رسالہ ہے "متعہ اور اسلام"۔ اس میں انہوں نے شروع سے اخیر تک سنیوں کی احادیث اور تفاسیر سے ثابت کیا ہے کہ متعہ کی اجازت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ صحابہؓ کا اس پر عمل رہا اور تابعین اور فقہائے مکہ اس کو بدستور جائز قرار

دیتے رہے۔ واضح رہے کہ ہم ان احادیث کو صحیح نہیں مانتے۔ اس لئے نہیں کہ یہ سنیوں کے خلاف جاتی ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ہماری بصیرت کے مطابق یہ قرآن کریم کی واضح تعلیم کے خلاف جاتی ہیں اور چونکہ رسول اللہ کا کوئی قول یا عمل قرآن کریم کے خلاف ہو نہیں سکتا اس لئے ہمارے نزدیک یہ روایات صحیح نہیں۔ لیکن یہ سنیوں کی حدیث کی اُن کتابوں میں موجود ہیں جنہیں وہ مستند مانتے ہیں۔ پہلے ان روایات کو دیکھئے جن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) خود متعہ کی اجازت دی تھی! کسے اجازت دی تھی؟ خود صحابہ کو!

سنیوں کی سب سے معتبر کتاب بخاری شریف ہے جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس میں (جلد دوم، ص۷۵۹ مطبوعہ کرزن گزٹ پریس دہلی، و جلد سوم ص۱۴۶ مطبوعہ مصر) حسب ذیل حدیث آئی ہے:

> عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ لڑائیوں پر جایا کرتے تھے اور ہمارے پاس کوئی سامان (اپنے مقتضائے فطرت کے پورا کرنے کا) نہ ہوتا تھا۔ تو ہم نے کہا کہ ہم اپنے اعضائے شہوانی کو قطع نہ کرادیں؟ حضورؐ نے ہمیں اس سے منع فرمایا۔ پھر ہمیں اجازت دی کہ عورتوں سے کسی کپڑا وغیرہ کے عوض میں "نکاح" کر لیا کریں۔ (صحیح بخاری جلد دوم مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور، ص۸۳۶، باب ۶۷۳، حدیث نمبر ۱۴۲۳۔)

بخاری کے بعد صحیح مسلم کا مرتبہ ہے۔ اس میں یہ روایت تین طریقوں سے آئی ہے۔ اس میں ایک جگہ "الی اجل" کا اضافہ ہے۔ "یعنی رسول اللہؐ نے ہمیں اجازت دی کہ ہم ایک میعادِ مقررہ کے لئے عورتوں سے کپڑے وغیرہ کے عوض نکاح کر لیا کریں۔" دوسری جگہ لکھا ہے کہ اس میں لڑائیوں کے زمانے کی تخصیص نہ تھی۔ (صحیح مسلم، مطبوعہ مجتبائی، دہلی، جلد ۱، ص۴۵۰)۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی جلد چہارم، ص۱۳، کتاب النکاح، شائع کردہ نعمانی کتب خانہ، لاہور)

جمع الفوائد (شیخ محمد بن محمد سلیمان سوسی مالکی، مطبوعہ میرٹھ، ج ۱، ص۲۲۲) میں اس روایت میں اتنا فرق ہے کہ حضرت ابنِ مسعودؓ نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لڑائیوں پر جاتے تھے اور ہمارے ساتھ عورتیں نہیں ہوتی تھیں۔ اس پر حضورؐ نے مذکورہ بالا اجازت دی تھی (یعنی ایک وقتِ معین کے لئے نکاح کی اجازت)۔

یہی روایت مسند امام ابی عبداللہ محمد بن ادریس شافعی، مطبوعہ مصر ص۱۲۵ میں بھی ہے نیز شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے دادا نے منتقی الاخبار میں اس روایت کو متفق علیہ قرار دیا ہے۔ اور صاحب کنز العمال

(صفحہ ۲۹۵، ج ۸) نے لکھا ہے کہ امام طبری نے تہذیب الآثار میں اس کی تخریج کی ہے۔

دوسری حدیث صحیح بخاری (مطبوعہ دہلی، جلد ۲، صفحہ ۷۶۷ و مصر، جلد ۳، صفحہ ۱۵۰) میں یوں درج ہے:

جابر بن عبداللہ اور سلمہ بن الاکوع کا بیان ہے کہ ہم ایک لشکر میں تھے کہ حضورؐ کا فرستادہ شخص ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا کہ تمہیں اجازت دی گئی ہے کہ تم متعہ کرو۔ اب تم متعہ کر سکتے ہو۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی، جلد چہارم، صفحہ ۱۶، کتاب النکاح، شائع کردہ نعمانی کتب خانہ اردو بازار لاہور)

صحیح مسلم (صفحہ ۴۵۰) میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضورؐ کے منادی کرنے والے نے آکر اعلان کیا کہ تم لوگوں کو متعہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ دوسری روایت (مسلم صفحہ ۴۵۱) میں ہے کہ حضورؐ نے خود تشریف لاکر متعہ کی اجازت کا اعلان فرمایا۔ (صحیح بخاری، جلد سوم، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور، صفحہ ۶۴، ۶۵، ۶۹، باب ۳۵، ۳۷، حدیث نمبر ۶۴ اور ۶۷)

تیسری حدیث بخاری (مطبوعہ دہلی، جلد ا، صفحہ ۷۶۷، و مصر جلد ۳، صفحہ ۱۵۰) میں یوں ہے:

سلمہ بن اکوع کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو مرد و عورت آپس میں قرار داد کر لیں تو تین راتوں تک ان کی مباشرت کی میعاد ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد اگر وہ چاہیں تو اس مدت میں اضافہ کر لیں۔ اور اگر چاہیں تو جدائی اختیار کر لیں۔ (ایضاً) صحیح بخاری، جلد سوم، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور، صفحہ ۶۴، ۶۵، ۶۹

صحیح مسلم (مطبوعہ دہلی، صفحہ ۴۵۱) میں ہے کہ حضورؐ نے جنگ اوطاس والے سال تین دن کے میعادی متعہ کی اجازت دی۔ یہی روایت جمع الفوائد، سنن، دار قطنی اور کنز العمال میں بھی ہے۔

اب ذرا اس کی تفصیل سنیئے۔ صحیح مسلم (مطبوعہ دہلی، صفحہ ۴۵۱) میں ہے:

سبرہ جہنی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے متعہ کی اجازت دی تو میں اور ایک بنی عامر کی ایک عورت کے پاس اکٹھے گئے اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے اپنی اجرت کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ میں اپنی چادر دوں گا۔ میرے ساتھی نے کہا کہ وہ اپنی چادر دے گا۔ اس کی چادر میری چادر سے اچھی تھی۔ لیکن میں اس کی نسبت جوان تھا۔ وہ عورت جب اس کی چادر کی طرف دیکھتی تھی تو اس کی طرف مائل ہو جاتی تھی اور جب میری طرف دیکھتی تو مجھے پسند کرتی۔ بالآخر اس نے کہا کہ تم اور تمہاری چادر میرے لئے کافی ہے چنانچہ تین روز تک میں اس کے پاس رہا۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی، جلد چہارم، صفحہ ۱۶، کتاب النکاح، شائع کردہ نعمانی

غور فرمایا آپ نے کہ جناب امام مسلم نیشاپوری صحابہ کبارؓ کا کیا نقشہ کھینچ رہے ہیں (استغفر اللہ

استغفر اللہ)۔

کنز العمال (جلد ۸، صفحہ ۲۹۴) میں سبرہ کی روایت ان الفاظ میں ہے کہ حجۃ الوداع میں

جب ہم مکہ معظمہ پہنچے تو خانہ کعبہ کا طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ پھر حضورؐ نے ہمیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی۔ ہم نے آکر عرض کیا کہ عورتیں متعہ کے لئے راضی نہیں ہوتیں جب تک کوئی میعاد مقرر نہ کی جائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میعاد مقرر کر کے متعہ کرو۔ (کنز الاعمال، مطبوعہ حیدر آباد، جلد ہشتم، صفحہ ۲۹۴)

آپ نے دیکھا کہ ہمارے راویوں کے بیان کے مطابق نبیٔ اکرمؐ اپنے آخری حج میں صحابہؓ کو کیا تعلیم دے رہے ہیں۔ (اللّٰھم اغفرلنا اللّٰھم اغفرلنا)۔

اہلِ سنت والجماعت حضرات کی مدافعت (DEFENCE) یہ ہوتی ہے کہ حضورؐ نے بے شک متعہ کی اجازت دی تھی۔ لیکن بعد میں اس کی ممانعت فرما دی تھی۔ یہ کہہ کر وہ اپنے جی میں خوش ہو لیتے ہیں کہ ہم نے اسلام کے ماتھے سے ایک بہت بڑے کلنک کے ٹیکے کو دھو دیا۔ لیکن یہ سادہ لوح اتنا نہیں سمجھتے کہ جو رسولؐ (ان راویوں کے بیان کے مطابق) اپنی نبوت کے آخری سالوں تک متعہ جیسے فعل کی اجازت دیتے رہے، اس رسولؐ کے متعلق (معاذ اللہ. معاذ اللہ) دنیا کیا رائے قائم کرے گی؟

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ متعہ کی ممانعت کی جس قدر روایات ہیں، ان میں ایسا تضاد رکھ دیا گیا ہے کہ سوچنے والا اُلٹا مخمصے میں پھنس جائے کہ یہ کیا پریشان کن روایات ہیں۔ مثلاً کنز العمال، جلد ۸، صفحہ ۲۹۵ میں ایک ہی راوی (سبرہ جہنی) سے جن کی روایات اوپر گزر چکی ہیں کہ حضورؐ نے متعہ کی اجازت حجۃ الوداع میں دی تھی — تین[1] مختلف روایات ہیں۔ جن میں سے

ایک میں ہے کہ حضورؐ نے خیبر کے دن متعہ کی ممانعت فرمائی۔ دوسری میں ہے کہ حضورؐ نے فتح مکہ کے دن ممانعت فرمائی۔ اور تیسری میں ہے کہ آپؐ نے حجۃ الوداع میں ممانعت فرمائی۔

لیکن شرح مسلم نووی (مطبوعہ دہلی، جلد ۱، صفحہ ۴۵۰) میں اسحٰق بن راشد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے جنگِ تبوک میں متعہ سے منع فرمایا۔

اندازہ فرمایا آپ نے کہ کس طرح کثرتِ تعبیر سے خواب کو پریشان کیا گیا ہے، چنانچہ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ متعہ ایک سے زیادہ مرتبہ جائز قرار دیا گیا اور ایک سے زیادہ مرتبہ اس کی ممانعت کی گئی

[1] یہ تینوں روایات صحیح مسلم مع شرح نووی، شائع کردہ نعمانی کتب خانہ لاہور جلد چہارم کے صفحات ۱۳ تا ۱۶ میں بھی درج ہیں۔

ہے۔ چنانچہ امام مسلمؒ نے اس بات کا عنوان ہی یہ قائم کیا ہے:

باب نکاح المتعه و بیان انه ابیح ثم نسخ واستقر تحریمه الی یوم القیامة۔ (صحیح مسلم شرح نووی جلد چہارم صـ۱۳۰ کتاب النکاح، شائع کردہ نعمانی کتب خانہ لاہور)

باب نکاح متعہ اس امر کے بیان میں کہ وہ مباح تھا پھر منسوخ ہوا۔ پھر مباح ہوا اور اس کے بعد پھر منسوخ ہوا اور پھر قیامت تک کے لئے اس کی حرمت قائم رہی۔

چلئے! ایک بات تو طے ہوئی کہ حضورؐ نے جب آخری بار متعہ کی ممانعت فرمادی تو پھر وہ قیامت تک کے لئے حرام ہو گیا۔

لیکن ٹھہریئے! اسی صحیح مسلم کے (جس نے اوپر لکھا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں متعہ قیامت تک کے لئے حرام ہو گیا) کچھ ورق آگے الٹئے اور دیکھئے کہ ان میں کیا نظر آتا ہے۔ جلد ا، صـ۴۵۱ پر درج ہے:

عطا کی روایت ہے کہ جابر بن عبداللہ عمرہ کے ارادے سے مکّہ معظمہ آئے تو ہم ان کی ملاقات کو گئے اور مختلف لوگوں نے ان سے سوالات دریافت کئے۔ پھر متعہ کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ ہاں! ہم لوگوں نے عہدِ رسولؐ اللہ اور عہدِ ابو بکرؓ اور عہدِ عمرؓ میں برابر متعہ کیا ہے۔ (ایضاً صـ۱۶)

لیجئے! رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اسے قیامت تک حرام قرار دے چکے ہیں لیکن صحابہ کبارؓ حضرت عمرؓ کے زمانہ تک متعہ کئے جارہے ہیں (معاذ اللہ)۔ اسی مسلم میں دوسری روایت یوں آئی ہے:

ابو الزبیر کا بیان ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہؓ کو کہتے ہوئے سنا کہ ہم لوگ برابر ایک مٹھی بھر جَو یا آٹے کے عوض میں متعہ کرتے رہے ہیں جناب رسالت مآبؐ کے زمانے میں اور حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے عمرو بن حریث والے واقعے میں اس کی ممانعت کی۔ (ایضاً جلد چہارم، صـ۱۶)

کنز العمال میں اس کی اجرت "ایک پیالہ بھر ستّو" لکھی ہے۔ اس کی تائید فتح الباری (شرح بخاری) جلد ۹، صـ۱۳۸ نے بھی کی ہے۔

کنز العمال (صـ۲۹۴) میں اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمایئے، تحریر ہے:

ام عبداللہ بنت ابی فثیمہ کی روایت ہے کہ ایک آدمی شام سے آیا اور ان کے مکان میں قیام کیا۔ اس نے کہا کہ بغیر عورت کے مجھے تکلیف ہے تم میرے لئے کوئی عورت تلاش کرو۔

جس سے میں متمتع ہو سکوں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے اُسے ایک عورت کا پتہ دیا اور اس نے اس سے متعہ کیا اور اس پر کچھ عدول لوگوں کی گواہیاں قرار دیں۔ پھر ایک طویل زمانے تک وہ اس کے ساتھ رہا اور اس کے بعد شام چلا گیا۔ کسی نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ انہوں نے مجھے بلوایا اور دریافت کیا کہ کیا یہ واقعہ صحیح ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں! انہوں نے فرمایا کہ جب وہ پھر آئے تو مجھے اطلاع دینا۔ جب وہ آیا تو میں نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی انہوں نے اُسے بلوا بھیجا اور کہا کہ یہ تم نے کیا کیا تھا؟ اس نے کہا کہ میں نے ایسا رسولؐ اللہ کے سامنے کیا۔ انہوں نے منع نہیں کیا یہاں تک کہ حضورؐ کا انتقال ہو گیا پھر حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایسا ہوا۔ انہوں نے بھی منع نہیں کیا۔ پھر خود آپ کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا رہا۔ آپ نے بھی کوئی ممانعت نہیں فرمائی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر میں پہلے ممانعت کر چکا ہوتا تو تمہیں سنگسار کر دیتا۔ اچھا جدائی اختیار کر لو تاکہ نکاح اور مسافحت (زنا) میں تمیز ہو سکے۔ (کنز الاعمال جلد ۸ مطبوعہ حیدرآباد دکن)

ابھی تک تو صرف صحابہؓ (مردوں) کا ذکر تھا۔ مندرجہ بالا روایت میں ایک صحابیہؓ کا ذکر بھی آگیا کہ انہوں نے اس "کارِ خیر" میں کس قدر مدد کی۔ (یا اللہ۔ توبہ) لیکن اسی پر اکتفا تھوڑا ہے۔ ذرا آگے بھی پڑھیئے لیکن ایسا کرنے سے پہلے حیاء سے کہیئے کہ وہ آنکھیں بند کر لے۔ غیرت سے کہیئے کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ شرم سے کہیئے کہ وہ اپنا مُنہ چھپالے کہ اب ذکر آ رہا ہے حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت عائشہ الصدیقہؓ کی بہن حضرت زبیرؓ کی رفیقہ حیات حضرت اسماء ذات النطاقین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا۔ یہ ذکر ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری (ص ۱۹) میں۔ وہاں لکھا ہے۔ (توبہ! توبہ! نقلِ کفر، کفر نباشد)۔

روی النسائی والطحاوی عن اسماء بنت ابی بکر قالت فعلناھا علی عھد رسول اللہ۔ (تفسیر مظہری اُردو، جلد سوم (سورۃ النساء) شائع کردہ دارالاشاعت اردو بازار کراچی)۔

حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ رسولؐ اللہ کے زمانے میں ہمارے ساتھ متعہ ہوا

اسی بناء پر جب حضرت اسماء کے بیٹے (عروہ) نے حضرت ابنِ عباسؓ سے کہا کہ "تم کو خدا کا خوف نہیں کہ تم متعہ کی اجازت دیتے ہو۔" تو حضرت ابنِ عباسؓ نے کہا کہ اسئل امک یا عروہ" ذرا جا کر اپنی والدہ

سے پوچھو۔" (زاد المعاد ھدی فی خیر العباد، جلد ۱، ص۲۱۹)

یلیتنی مت قبل ھذا و کنت نسیا منسیا

بہر حال، یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے متعہ کی ممانعت کی تھی یا نہیں کی تھی، لیکن حضرت عمرؓ نے اسے ضرور بند کر دیا۔ چنانچہ زاد المعاد (ابنِ قیم، جلد ۱، ص۲۴۳) میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "دو متعہ تھے جو رسول اللہ کے زمانے میں رائج تھے۔ لیکن میں انہیں بند کرتا ہوں۔ ایک متعہ حج اور دوسرا عورتوں سے کے ساتھ۔" آپ کو اطمینان ہو گیا ہو گا کہ چلئے! حضرت عمرؓ کے زمانے ہی میں سہی۔ یہ لغویت تو ختم ہوئی۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ سازش ہی کیا جو اس طرح ختم ہو جائے! ابھی سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ چنانچہ فتح الباری (شرح صحیح بخاری) جلد ۹، ص۱۳۸ پر ہے۔

> ابن عبد البر نے کہا ہے کہ ابنِ عباسؓ کے تمام اصحاب جو اہلِ مکہ اور یمن سے تھے، جوازِ متعہ کے قائل تھے۔ ابنِ حزم نے کہا ہے کہ تابعین میں سے طاؤس اور سعید بن جبیر اور عطاء اور تمام فقہائے مکہ اسے جائز سمجھتے تھے۔ (فتح الباری شرح صحیح بخاری، جلد نہم، ص۱۳۵، مصنف حافظ ابن حجر عسقلانی، مطبوعہ مصر)

یہ ہیں وہ احادیثِ مقدسہ اور ہمارے ائمہ کے اقوال اس متعہ کے متعلق جسے (اس روایت کی رُو سے جو درج کی جا چکی ہے) خود حضرت عمرؓ نے مسافحت (زنا) قرار دیا تھا۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ سنی حضرات مناظروں اور مباحثوں میں ان اعتراضات کا کیا جواب دیتے ہیں۔ ہمیں تو صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ تمام روایات اور ان کی شرحیں سنیوں کی اپنی کتابوں کے اندر موجود ہیں اور کتابیں وہ ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر متلو وحی کہا جاتا ہے۔ جنہیں قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل (مثلہ معہ) ٹھہرایا جاتا ہے۔ جن کی تعلیم سے ہمارے "علمائے کرام" کو سندِ فضیلت ملتی ہے۔ جن کے درس نمازوں کے بعد مسجد میں باعثِ سعادتِ کونین تصور کئے جاتے ہیں۔ جنہیں مسلمان اس لئے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں کہ ان کے ذریعے سنتِ رسول اللہ اور سنتِ صحابہ کبارؓ کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ان کتابوں میں ہے!

لیکن ٹھہریئے۔ ابھی تک معاملہ صرف روایات تک محدود تھا۔ قرآن سامنے نہیں آیا تھا۔ اب دیکھئے کہ

---

[1] متعہ حج (حج اور عمرہ کے تمتع (۲/۱۹۶) کے بند کرنے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ (طلوعِ اسلام)

اس سلسلہ میں کس طرح قرآن کو بھی ساتھ ہی لپیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

امام طبریؒ کی تفسیر اہلِ سنّت والجماعت کے ہاں امّ التفاسیر کہلاتی ہے۔ یہ سب سے پہلی مدوّن تفسیر ہے۔ بعد کی تمام تفسیریں قریب قریب اسی کے تتبع میں لکھی گئیں۔ دیکھئے کہ حضرت امام طبری متعہ کی سند کس طرح لاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ابو ثابت کا بیان ہے کہ ابنِ عباسؓ نے مجھے ایک مصحف دیا اور کہا کہ یہ ابی بن کعب کی قرأت کے مطابق ہے۔ یحیٰی بن عیسٰی جو اس روایت کے ناقل ہیں، نصیر بن ابی الاشعث سے ان کا بیان ہے کہ اس مصحف کو نصیر کے پاس دیکھا۔ اس میں لکھا ہے کہ فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجل مسمّیٰ (یعنی تم عورتوں سے متعہ کرو ایک میعادِ مقررہ کے لئے)۔
>
> ابو نضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم سورۂ نسآء کی تلاوت نہیں کرتے۔ میں نے کہا۔ کیوں نہیں؟ کہا پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجل مسمّیٰ.... میں نے کہا نہیں میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انہوں نے کہا اچھا تو معلوم ہونا چاہئے کہ اصلی آیت یونہی ہے۔ عبد الاعلیٰ کی روایت میں بھی ابو نضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباسؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی۔ فما استمتعتم بہ منھن۔ ابن عباسؓ نے کہا۔ الیٰ اجلٍ مسمّیٰ۔ میں نے کہا کہ میں تو اس طرح نہیں پڑھتا۔ انہوں نے تین مرتبہ کہا خدا کی قسم خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے[1]۔ ابو اسحٰق کی روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے پڑھا فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجلٍ مسمّیٰ۔ پانچویں روایت شعبہ کی ہے۔ اور اس میں بھی ابو اسحٰق سے ہی روایت ہے۔ قتادہ کا بیان ہے کہ ابی بن کعب کی قرأت میں یوں ہے۔ فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجلٍ مسمّیٰ۔ عمرو بن مرہ کی روایت ہے کہ میں نے سعید بن جبیر کو پڑھتے سنا۔ فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجلٍ مسمّیٰ۔ (تفسیر طبری، سورت النساء، آیت ۲۴)

یہ اقتباس کسی شیعہ بزرگ کی کتاب کا نہیں۔ بلکہ سنّیوں کے جلیل القدر امام طبری کی تفسیر کا ہے۔

---

[1] اس کی تفصیل اس مضمون میں دیکھئے جس کا عنوان ہے۔ "قرآنِ کریم روایات کے آئینے میں"۔

اور جن حضرات کی طرف یہ روایات منسوب ہیں وہ بلند پایہ صحابی ہیں جو قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے کہ یہ آیت اس طرح نازل نہیں ہوئی تھی جس طرح قرآن میں درج ہے۔ بلکہ اس اضافہ کے ساتھ نازل ہوئی تھی جس سے متعہ کا جواز ثابت ہوتا تھا۔ غور کیا آپ نے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔

تصریحاتِ بالا سے آپ دیکھئے کہ سنیوں کی نہایت معتبر کتبِ روایات اور مستند تفاسیر میں خدا، رسولؐ، صحابہ، تابعین وغیرہ کی کس قسم کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ان روایات اور تفاسیر کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ

(i) جو آیات قرآن میں درج ہیں وہ اسی شکل میں نازل نہیں ہوئی تھیں بلکہ مختلف صحابہؓ کی قراتوں کی رو سے ان کی تنزیلی شکلیں کچھ اور تھیں۔

(ii) خود رسول اللہ نے صحابہؓ کو مٹھی بھر جو یا آٹے کے عوض میں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور یہ اجازت نبوّت کے آخری دور تک جاری رہی۔

(iii) عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صحابہؓ کے اسلامی معاشرہ میں متعہ عام تھا۔ اور اس میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی نہ مردوں کو نہ عورتوں کو۔

(iv) رسول اللہ نے اپنے آخری زمانہ میں متعہ کو حرام قرار دے دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عہدِ حضرت ابوبکرؓ اور عہدِ حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک متعہ برابر جاری رہا۔

(v) حضرت عمرؓ نے متعہ کو بند کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود صحابہ، تابعین اور فقہائے مکہ اسے جائز سمجھتے رہے۔

(vi) اور جنہوں نے اسے طوعاً و کرہاً ناجائز سمجھا وہ بھی یہ کہتے رہے کہ عمرؓ نے خدا کی ایک بہت بڑی رحمت کو روک دیا۔

چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی تفسیر مظہری (ص۱۹) میں لکھتے ہیں کہ:۔

> محدّث عبدالرزاق نے اپنی کتاب میں ابن جریج سے اور انہوں نے عطا سے روایت کی ہے کہ ابن عباسؓ کہا کرتے تھے کہ متعہ کا جائز ہونا خدا کی طرف سے اپنے بندوں پر رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر عمرؓ نے اس کی ممانعت نہ کر دی ہوتی تو کبھی کسی کو زنا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ (تفسیر مظہری اردو جلد سوم، ص۱۹ (سورت النساء) شائع کردہ دارالاشاعت، کراچی)۔

کیا آپ کسی طرح بھی باور کرنے کو تیار ہیں کہ یہ احادیث واقعی رسول اللہ کی ہو سکتی ہیں۔ پھر سُن رکھئے کہ یہ احادیث شیعہ حضرات کی احادیث کی کتابوں سے نہیں لی گئیں۔ یہ اہلِ سنّت والجماعت کی حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں درج ہیں۔ اور ان کے انکار کرنے والے کو "منکرِ حدیث" قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

نوٹ: متعہ کے بارے میں یہ تمام احادیث جو مختلف کتبِ حدیث سے پیش کی گئی ہیں وہ سب صحیح مسلم مع شرح نووی کی جلد چہارم کی کتاب النکاح میں صفحہ ۱۲ تا ۲۲ یکجا ملتی ہیں۔ حدیث کی یہ کتاب، نعمانی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور کی جانب سے شائع کی گئی ہے۔

حصولِ جنّت

(احادیث کی رُو سے)

اسلام نام ہے نظامِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ جب جماعتِ مومنین اس نظام کے قیام کے لئے اٹھتی ہے تو دنیا بھر کی مفاد پرست قوتیں چاروں طرف سے اس کی مخالفت کے لئے ہجوم کرکے اُمنڈ آتی ہیں۔ اس جماعت کو ان تمام قوتوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کے قائم کرنے اور اسے مستحکم رکھنے کے لئے مسلسل سعی و عمل اور پیہم جدّ و جہد کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے مؤمن کی زندگی مسلسل جہاد کی زندگی ہوتی ہے۔ یہی وہ مجاہدانہ سرگرمیاں اور سپاہیانہ کوششیں ہیں جن کے بعد ایک عبدِ مومن کو جنّت ملتی ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ جنّت یونہی بیٹھے بٹھلائے مل جاتی ہے، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ

جنّت میں داخلہ

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ۝ (۲/۲۱۴)

کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ تم جنّت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے؟ ایسا نہیں ہو سکے گا تمہیں بھی انہی مراحل سے گذرنا ہوگا۔ جن مراحل سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے اس قسم کے انقلاب کی کوشش کی۔ مخالفت کے ہجوم سے ان لوگوں کی حالت یہ

ہو گئی کہ سختیوں اور مصیبتوں نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا اور وہ گھبرا اٹھے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہماری کوششوں کی بار آوری کا وقت کب آئے گا؟ تب کہیں جا کر ان کی کوششیں ثمر بار ہوئیں۔

دوسری جگہ ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ. (۳/۱۴۲)

کیا تمہارا خیال ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم نے اپنے اعمال و کردار سے یہ ثابت ہی نہیں کیا کہ تم میں سے کون کس قدر سعی و عمل کا مالک ہے اور کون کس قدر استقامت کا حامل۔

یہ تھی وہ جنت جس کا وعدہ قرآن نے کیا تھا۔ یعنی خالص سعی و عمل کا نتیجہ (جزاء بما کانوا یعملون (۳۲/۱۷) وہ جنت جو مومن کے خونِ جگر میں پوشیدہ تھی۔

یہ تو تھی قرآن کریم کی تعلیم۔ لیکن اس کے برعکس آپ دیکھئے کہ احادیث کی رُو سے جنت کس قدر سستی اور سہل الحصول بنا دی گئی۔ ذرا غور کیجئے۔

مصافحہ

ابو داؤد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیتا ہے۔ (سنن ابوداؤد، جلد سوم، صفحہ ۴۲۸، مطبوعہ نعمانی کتب خانہ، لاہور)۔

وضو سے جنت

مسلم کی حدیث ہے کہ وضو کرنے والے کے تمام گناہ پانی کے ساتھ ٹپک جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ پانی کا آخری قطرہ ہر عضو کے آخری گناہ کو ساتھ لے کر ٹپکتا ہے۔ (صحیح مسلم مع شرح نودی، جلد اول، صفحہ ۳۷۹ (باب الوضو)، شائع کردہ نعمانی کتب خانہ، لاہور)۔

مسلم ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ جو شخص پورا پورا وضو کرتا ہے اور وضو کے بعد نماز پڑھتا ہے اور نماز بھی اچھی طرح ادا کرتا ہے تو نماز کے بعد بالکل ایسا ہو جاتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے۔ (ایضاً)

تیسری حدیث میں ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کرتا ہے اور وضو کے بعد یہ کلمات کہتا ہے: اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ"۔ تو ایسے

شخص کے لئے جنّت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں"۔ (ایضاً)

ابنِ خزیمہ کی روایت ہے کہ نبیِ اکرمؐ نے حضرت بلالؓ سے دریافت کیا کہ تم کیا عمل کرتے ہو؟ میں نے تمہاری جوتیوں کی آواز جنّت میں سنی کہ تم مجھ سے بھی آگے چل رہے ہو۔ بلالؓ نے عرض کیا کہ دو کام میرے معمول ہیں۔ ایک ہمیشہ باوضو رہتا ہوں۔ جب وضو ٹوٹ جاتا ہے تو فوراً دوسرا وضو کر لیتا ہوں اور جب وضو کرتا ہوں تو دو رکعتیں نفل ادا کر لیا کرتا ہوں۔ (ایضاً)

آپ نے دیکھا کہ جنّت کس قدر آسانی سے مل جاتی ہے۔ یعنی وضو کیا تو تمام گناہ پانی میں بہہ گئے اور اگر ساتھ دو رکعتیں نفل پڑھ لئے تو خود رسولؐ اللہ سے بھی آگے آگے جنّت میں پہنچ گئے۔

اس سے بھی آسان

مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص مؤذن کے جواب میں اذان کے الفاظ دہراتا ہے۔ لیکن حیّ علی الصّلوٰۃ اور حیّ علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولا قوّۃ الّا باللّٰہ کہتا ہے تو یہ شخص جنّت میں جائے گا۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی جلد دوم ص۱۳ مطبوعہ نعمانی کتب خانہ لاہور)

گناہ کئے جاؤ

طبرانی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تم جلتے رہتے ہو۔ یعنی آگ کے کام کرتے رہتے ہو لیکن جب صبح کی نماز پڑھ لیتے ہو تو وہ تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ یعنی دوزخ سے دُور کر دیتی ہے۔ پھر ظہر تک وہی کام کرتے ہو لیکن ظہر کی نماز تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں اپنے درمیانی اوقات کے گناہوں کو مٹا کر ٹھنڈا کر دیتی ہیں۔ جب تم سو رہتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا۔ یہاں تک کہ نیند سے جاگو (اور اگر رات کو دوزخ کے کام کرتے رہو تو صبح کی نماز انہیں ٹھنڈا کر دے گی)۔

باجماعت نماز

ترمذی کی حدیث ہے کہ چالیس دن تک تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرنے والا دوزخ اور نفاق دونوں سے بری کر دیا جاتا ہے۔ (جامع ترمذی اُردو جلد اوّل ص۱۴۵ شائع کردہ

بخاری اور مسلم دونوں میں ہے کہ جب امام سورۃ فاتحہ ختم کرتا ہے اور وَلَا الضَّآلِّیْن کہتا ہے تو فرشتے آمین کہتے ہیں۔ مقتدیوں میں سے جس شخص کی آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ ادا ہوئی،

اور رعایت

اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی جلد دوم ص۳۲ مطبوعہ نعمانی کتب خانہ لاہور)

بخاری اور امام مالکؒ کی ایک حدیث میں ہے کہ جب امام سمع اللّٰہ لمن حمدہٗ کہہ کر رکوع سے سر اٹھائے تو تم ربّنا لک الحمد کہا کرو۔ جو بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اس کے تمام گناہ بخش

دیئے جاتے ہیں۔

جنّت میں گھر

یہاں تو صرف گناہ بخشنے کا ذکر تھا' مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص علاوہ فرض کے دن رات میں بارہ رکعتیں پڑھ لے' اس کے لئے جنّت میں ایک گھر بنا دیا جاتا ہے۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی اردو' جلد دوم' صـ۲۳۶' مطبوعہ نعمانی کتب خانہ' لاہور)

ترمذی کی روایت ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد بیس رکعت نفل پڑھنے والے کے لئے جنّت میں گھر بنا دیا جاتا ہے۔ (جامع ترمذی اردو' جلد اوّل' صـ۲۲' مطبوعہ دارالاشاعت' کراچی)۔

ابوداؤد میں ہے کہ ظہر کے فرضوں سے پہلے جو شخص چار رکعتیں پڑھتا ہے' اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ (سنن ابوداؤد اردو' جلد اوّل' صـ۵۱۷' مطبوعہ نعمانی کتب خانہ' لاہور)۔

تمام گناہ معاف

مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کر کے جمعہ کے لئے آیا، اور خاموش بیٹھ کر خطبہ سُنا تو اس کے گناہ نہ صرف جمعہ سے جمعہ تک بخش دیئے جاتے ہیں بلکہ تین دن کے اور زائد گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی' جلد دوم' صـ۳۲۰' مطبوعہ نعمانی کتب خانہ' لاہور)

وظائف سے جنّت

وظائف' عجمی اسلام کا امتیازِ خصوصی ہیں۔ "دین اور دنیا" کا کوئی معاملہ پیش آ جائے' اس کے لئے نہ کسی محنت کی ضرورت ہے نہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی حاجت۔ بس ایک وظیفہ پڑھ لیجئے' مطلب حل ہو جائے گا۔ انہی وظائف سے جنّت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً نسائی کی حدیث ہے کہ جس نے صبح اور مغرب کی نماز کے بعد سات مرتبہ اللّٰھم اجرنی من النار (یا اللہ مجھے دوزخ سے نجات دے) پڑھ لیا تو دن اور رات میں کسی وقت بھی مر جائے وہ جنّت میں جائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے والا اگر دوسری نماز کے وقت سے پہلے مر جائے تو جنّت میں جائے گا۔

ترمذی میں ہے کہ جس نے بستر پر لیٹتے وقت کہا۔ استغفر اللّٰہ الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ۔ اس کے تمام گناہ بخش دیئے گئے۔ وہ گناہ خواہ دریاؤں کی جھاگ کے برابر ہوں یا درختوں کے پتوں کے برابر' ریگ کے ذرّوں کے برابر ہوں یا ان کی تعداد ایام دنیا کی مثل ہو، یعنی ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جتنے دن ہوں ان کی مثل بھی گناہ ہوں تو سب بخش دیئے جائیں گے۔
(جامع ترمذی اُردو' جلد دوم' صـ۴۳۲' مطبوعہ دارالاشاعت' اردو بازار' کراچی)۔

مسلم میں ہے کہ ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، کہہ لیا کرو۔ جس نے یہ وظیفہ پڑھا۔ اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اگرچہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی اُردو، جلد دوم، صفحہ ۱۵۲، کتاب المساجد، مطبوعہ نعمانی کتب خانہ، اردو بازار لاہور)

ترمذی میں ہے کہ جس نے ہر دن میں سو بار قل ہو اللہ پڑھنے کا وِرد کر لیا تو اس کے پچاس سالہ گناہ مِٹ گئے۔ (جامع ترمذی اُردو، جلد دوم، صفحہ ۲۱۲، مطبوعہ دارالاشاعت، کراچی)۔

مسند امام احمدؒ میں ہے کہ حضرت ام ہانیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ہلکا سا وظیفہ بتا دیجئے۔ کیوں کہ میں بہت بڑھیا ہو گئی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ سبحان اللہ سو بار پڑھا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو غلام آزاد کئے اور وہ بھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کے۔ سو بار الحمد للہ پڑھا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو گھوڑے زین اور لگام سمیت مجاہدین کو دے دیئے۔ سو بار اللہ اکبر کہا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو اونٹ مع نکیل وغیرہ کے اللہ کے راستے میں دیئے اور سو بار لا الٰہ الا اللہ کہا کرو۔ یہ کلمہ زمین و آسمان کو ثواب سے بھر دیتا ہے۔ جس دن یہ وظیفہ پڑھے گی اس دن کسی کے اعمال بھی تیرے اعمال کے برابر آسمان پر نہ جائیں گے۔ ہاں اگر کوئی دوسرا بھی یہ وظیفہ پڑھے تو اس کے اعمال بیشک تیرے اعمال کے برابر ہوں گے۔

حاکم کی روایت ہے کہ جس نے اپنی بیماری میں چالیس مرتبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ پڑھا اور پھر اسی بیماری میں مر گیا تو اس کو ایک شہید کے برابر ثواب ملتا ہے اور اگر اس بیماری سے اچھا ہو گیا ہے تو تمام گناہوں سے پاک ہو کر اچھا ہوتا ہے۔

شہادت

قرآنی نظام کے قیام کی جدوجہد میں ہر قربانی اپنی جگہ وزن رکھتی ہے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ گراں بہا قربانی انسان کی جان کی قربانی ہے۔ قرآن نے ان سعادت مند نفوس کو "مقتول فی سبیل اللہ" (اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے) کہہ کر پکارا ہے۔ انہیں عام طور پر شہید کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی اعمال میں شہادت کا مرتبہ بہت بلند ہے اور مخالفین کے لئے "اللہ کی راہ میں لڑنے والوں" سے بڑھ کر سخت مقابلہ کرنے والا اور کوئی نہیں۔ یہی مجاہدین اور مقتولین فی سبیل اللہ تھے جنہوں نے باطل کی قوتوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ اس لئے ان قوتوں کو دوبارہ اُبھرنے کا موقعہ نہ دینے کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان کو جہاد اور قتال فی سبیل اللہ سے بیگانہ کر دیا جائے۔ اب دیکھئے کہ اس کے لئے ہماری کتبِ احادیث میں کس قسم کی روایات داخل کر دی گئیں۔

مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو! حاضرین نے عرض کیا کہ جو خدا کی راہ میں مارا جائے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح تو میری امت میں شہداء کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ پھر شہید کون ہے؟ فرمایا جو خدا کی راہ میں مارا گیا وہ شہید، جو طاعون سے مر گیا وہ شہید، جو اسہال (دستوں کی بیماری) سے مر گیا وہ شہید، جو پانی میں ڈوب کر مر گیا وہ شہید، جو مکان کے گرنے سے دب کر مر جائے وہ شہید۔ (اسی طرح ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ) جو نمونیہ سے مر جائے وہ شہید۔ جو آگ میں جل کر مر جائے وہ بھی شہید۔ جو عورت وضع حمل سے مر جائے وہ بھی شہید۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی اردو، جلد پنجم، صفحہ ۱۸۱، مطبوعہ نعمانی کتب خانہ لاہور)

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ ان "شہداء" کو اللہ کے ہاں رعایات کیا ملتی ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ شہید سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ لیکن روایات کی رُو سے وہ اکیلا ہی جنت میں نہیں جاتا۔ بلکہ اپنے ساتھ بہت سے اقرباء کو جنت میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ شہید کو اپنے خویش و اقارب میں سے ستر آدمیوں کی شفاعت کا حق دیا جائے گا۔

مسافر کی موت

نسائی میں ہے کہ ایک شخص کی وفات مدینہ منورہ میں واقع ہوئی۔ حضورؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ نماز کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ اچھا ہوتا اگر یہ غیر وطن میں مرتا۔ کسی نے عرض کیا حضورؐ! سفر میں مرنے سے کیا فائدہ؟ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص سفر میں مرتا ہے تو موت کی جگہ سے لے کر اس کے وطن تک کی مسافت کے برابر جنت میں جگہ دی جاتی ہے۔ (سنن نسائی اردو، جلد اول، صفحہ ۵۶۳، باب نمبر ۱۰۳۶، مطبوعہ دارالاشاعت اردو بازار کراچی)

لڑکیوں کا باپ

اولاد کے معاملے میں انسان بے بس ہے کہ اس کے ہاں لڑکے پیدا ہوں یا لڑکیاں۔ لیکن اس بے بسی میں بھی ایک رعایت کا پہلو ہے۔ حاکم کی روایت ہے کہ جس شخص کے ہاں دو لڑکیاں ہیں اور اس نے ان کے ساتھ بھلائی کی۔ جب تک وہ اس کے پاس رہیں، تو یہ لڑکیاں اسے جنت میں لے جائیں گی۔

یہ تو رہا اس شخص کا معاملہ جس کی اولاد زندہ رہے۔ اب رہا وہ جس کے بچے فوت ہو جائیں، تو اس کے متعلق صحیحین (بخاری اور مسلم) کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس مسلمان کے تین نابالغ بچے مر گئے خدائے تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔

بخاری اور مسلم ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ کسی شخص کے تین بچے مر جائیں اور پھر اُسے آگ چھوئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ صرف قسم پورا کرنے کے لئے اُسے صراط پر سے گزارہ جائے گا! (صحیح مسلم مع شرح نووی، اردو جلد ششم صفحہ ۳۳۵-۳۳۶، مطبوعہ نعمانی کتب خانہ لاہور)۔

نسائی میں ہے کہ تین بچوں کی وفات پر جنّت ملنے کی بشارت سُن کر ایک عورت نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ جس کے دو ہی بچے مرے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ دو کے مرنے پر بھی یہی بشارت ہے۔ اس عورت نے بعد میں کہا کاش میں ایک بچے کے متعلق بھی پوچھ لیتی، تو اچھا ہوتا۔ (سنن نسائی اردو جلد اوّل صفحہ ۵۵۶ باب نمبر ۱۰۵۲ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

لیکن اس کمی کو سنن امام احمدؒ کی ایک روایت نے پورا کر دیا۔ حضرت معاذؓ کی روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے صرف ایک بچے کی وفات پر بھی جنّت کی بشارت دی ہے۔ حتّٰی کہ اسقاطِ حمل پر بھی۔

زانیہ عورت

قرآن کی رُو سے زنا بہت بڑا جرم ہے۔ لیکن دیکھئے کہ یہ جرم بھی کتنی آسانی سے معاف ہو جاتا ہے۔ بخاری میں ہے کہ ایک زانیہ عورت نے دیکھا کہ ایک کتیا پیاس سے تڑپ رہی ہے۔ اس نے اپنا موزہ نکالا اور دوپٹے سے باندھ کر کنوئیں سے پانی نکال کر اسے پلا دیا۔ اس پر اللہ نے اسے جنّت میں بھیج دیا۔

جہنّمیوں کی رہائی

امام بیہقی کی روایت ہے کہ رمضان کی ہر رات میں چھ لاکھ دوزخی آزاد کئے جاتے ہیں اور رمضان کی آخری شب میں تمام گزشتہ تعداد کی مثل دوزخ سے آزاد کئے جاتے ہیں۔

اسی طرح مسلم میں ہے کہ عرفہ کا روزہ رکھنے سے ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور محرّم کی دسویں کا روزہ گزشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ابن ماجہ میں ہے کہ اس سے آئندہ ایک سال کے گناہوں کا بھی کفارہ ہو جاتا ہے۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی اردو جلد سوم صفحہ ۱۴۶ (روزوں کا بیان) مطبوعہ نعمانی کتب خانہ لاہور)

سانپ اور گرگٹ مارنے والا

مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص گرگٹ کو پہلی ہی ضرب میں مار دے تو اس کا ثواب اس سے زیادہ ہے جو دو ضربوں میں مارے۔ اور دو ضربوں میں مارنے والے کا ثواب اس سے زیادہ ہے جو تین ضربوں سے مارے[1]۔

ابوداؤد کی روایت ہے کہ اگر گھر میں سانپ نکلے تو اس سے کہہ دے کہ تجھے قسم ہے اس عہد کی جو تو نے حضرت نوحؑ اور حضرت سلیمان علیہما السلام سے کیا تھا، ہم کو ایذا نہ دیجئو۔ اگر اس کے بعد بھی نکلے تو اُسے مار ڈالے۔ امام احمدؒ کی مسند کے مطابق اسے سات نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ (سنن ابوداؤد اردو جلد سوم صفحہ ۴۲۵، مطبوعہ نعمانی کتب خانہ لاہور)

قرآن کی تلاوت

قرآن نظامِ خداوندی کا ضابطۂ قانون ہے جس کے مطابق انسانی معاشرے کی تشکیل ہونی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ قانون عمل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور اگر

[1] ایضاً جلد پنجم صفحہ ۳۰۸، باب گرگٹ کا مارنا مستحب ہے)۔

مسلمانوں کا عمل قرآن کے مطابق رہتا تو باطل کی قوتیں کبھی سر نہ اٹھا سکتیں. لہٰذا مخالفینِ اسلام کی پہلی تدبیر یہ تھی کہ مسلمانوں کو کسی طرح اسلام سے بیگانہ کر دیا جائے. اس کے لئے انہوں نے مسلمانوں کو یہ بتایا کہ قرآن فقط پڑھنے کی چیز ہے، عمل کرنے کی نہیں. ثواب اس کے پڑھنے سے ملتا ہے. جہاں قرآن کے اعمال کا ذکر ہے، اس سے مراد وہ عملیات ہیں جن کی رُو سے بھوت پریت دُور کئے جاتے ہیں. یہ بھی واضح ہے کہ قرآنِ مجید پر عمل اُسی صورت میں کیا جاسکے گا کہ اِسے سمجھ کر پڑھا جائے. اس پر غور و فکر کیا جائے. لیکن روایات نے اس ضرورت کو بھی ختم کر دیا اور کہہ دیا کہ قرآن کے الفاظ بلامعانی اور مطلب پڑھ لینے سے بھی ثواب ہوتا ہے. اس طرح انہوں نے مسلمانوں کو قرآن کے الفاظ دُہرانے میں اُلجھا دیا. یعنی صرف پڑھنے میں. قرآن کے الفاظ دُہرانے کی برکات کے متعلق تمام کتبِ احادیث بھری پڑی ہیں. نمونۃً دو ایک مثالیں سُن لیجئے.

صحیحین کی روایت ہے کہ ایک صحابی رات کو قرآن پڑھ رہے تھے. گھوڑا پاس بندھا تھا. وہ اُچھلنے لگا تو انہوں نے قرأت ختم کر دی. آسمان کی طرف دیکھا تو بہت سے چراغ معلوم ہوئے جو نیچے سے اوپر کو جا رہے تھے۔ صبح کو حضورؐ سے ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا. یہ فرشتے تیرا قرآن سننے آرہے تھے. اگر تو پڑھے جاتا تو عجیب و غریب چیزیں دیکھتا. (صحیح مسلم مع شرح نووی، جلد دوم، صـ۲۶۷، باب قرأتِ قرآن، مطبوعہ نعمانی کتب خانہ، لاہور)

مسلم کی روایت ہے کہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں دو نُور ہیں. جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو عطا نہیں ہوئے. جو کوئی ایک حرف بھی ان کا پڑھے گا، اس کو وہ نور دیا جائے گا. (ایضاً جلد دوم، صـ۲۸۲).

مستدرک، حاکم میں ہے کہ آیت الکرسی جس گھر میں پڑھی جاتی ہے، اس گھر سے شیطان نکل بھاگتا ہے.

ترمذی میں ہے کہ اگر سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں کسی جنگل میں تین دن رات پڑھی جائیں تو پھر وہاں شیطان کا اثر نہیں ہوتا. (جامع ترمذی، جلد دوم، صـ۲۰۸، مطبوعہ دارالاشاعت، کراچی).

سنن ابنِ ماجہ میں ہے کہ سورۂ یٰسین قرآن کا دل ہے. جو بندہ اس کو رضائے الٰہی اور دارِ آخرت کے لئے پڑھتا ہے وہ بخشا جاتا ہے. تم اسے اپنے مُردوں پر پڑھا کرو. (سنن ابنِ ماجہ اردو، جلد اوّل، صـ۴۳۰، مطبوعہ اسلامی اکیڈمی، اردو بازار، لاہور)

ترمذی میں ہے کہ جو شخص سورۂ یٰسین کو ایک دفعہ پڑھ لیتا ہے، اس کو دس بار قرآن پڑھنے کا ثواب ملتا ہے. (جامع ترمذی اُردو، جلد دوم، صـ۲۹، مطبوعہ دارالاشاعت، کراچی)

موطا، امام مالکؒ میں ہے کہ حضورؐ نے ایک شخص کو قُل ھو اللہ احد پڑھتے ہوئے سُن کر فرمایا کہ اس پر واجب ہوگئی. کسی نے دریافت کیا کہ کیا واجب ہوگئی. فرمایا جنّت واجب ہوگئی.

حاکم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خوش آواز قرآن خواں کی آواز کو نہایت شوق سے سنتا ہے. جیسے کوئی گانا سننے والا گانے والے کی آواز کو شوق سے سنتا ہے.

جنّت ضعیفوں اور کمزوروں کے لئے ہے

باطل کی قوّتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے حق کے پاس مخالفین کی قوّتوں سے بڑھ کر قوّت ہونی چاہیئے. اس لئے اسلام غلبہ اور قوّت کا دین ہے. فان حزب الله هم الغالبون (غلبہ اور تمکّن اللہ کے لشکر کے لئے ہے). قرآن بار بار مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے پاس اتنی قوّت جمع رکھو کہ اس سے مخالفین کے دل پر تمہارا رعب چھایا رہے. جماعتِ مومنین کی قوّت ہی تھی جس نے قیصر وکسریٰ کی شوکت وسطوت کو غبارِ راہ بنا دیا تھا. اس لئے مخالفین یہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے دل سے یہ خیال نہ نکال دیا جائے کہ قوّت وسطوت خدا کے ہاں برگزیدگی کا موجب ہوگی، ان پر غلبہ پانا ناممکن ہے لہٰذا انہوں نے اس قسم کی احادیث وضع کرنی شروع کر دیں کہ خدا کے مقرب بندے وہ ہیں جو ضعیف وناتواں ہیں، جن پر محتاجی اور مفلسی چھائی رہتی ہے. جو کمزوری اور بے چارگی کے مجسمے ہیں، جو دنیا میں ذلیل وخوار ہیں چنانچہ بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا کہ اکثریت سے اس میں وہ لوگ ہیں جو دنیا میں فقیر تھے. (صحیح مسلم مع شرح نووی، جلد ششم، صفحہ ۳۰۹، باب "جنتیوں اور دوزخیوں کا بیان" مطبوعہ نعمانی کتب خانہ، لاہور)

طبرانی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میرا حوض بہت لمبا چوڑا ہے. اس کے آب خوروں کی تعداد اتنی ہے جتنے آسمان کے تارے. اس کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے. جو لوگ سب سے زیادہ اس حوض پر آئیں گے وہ فقرائے مہاجرین ہوں گے. کسی نے عرض کیا ان کا حال بیان فرمایئے. وہ کون لوگ ہیں. فرمایا. یہی لوگ، جن کے بال پریشان، کپڑے میلے کچیلے، اونچے درجے کے لوگ انہیں اپنی بیٹی نہیں دیتے. کوئی ان کے پاس پھٹکنے کا روادار نہیں. ان پر کسی کا حق ہو تو وہ چھاتی پر چڑھ کر لے لے. اور اگر ان کا کسی پر حق ہو تو یہ بچارے اپنی کمزوری کے باعث کچھ نہ کر سکیں. (ایضاً)

غور فرمایا آپ نے کہ خدا کے مقربین کی کیا خصوصیات بیان ہوئی ہیں! ژولیدہ مو، پریشان حال، بوسیدہ اور میلا کچیلا لباس. کوئی انہیں اپنے پاس تک نہیں پھٹکنے دیتا. کمزوری اور ناتوانی کا یہ عالم کہ بالادست ان کا حق دبا کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ بچارے سوائے آہ بھر کر رہ جانے کے کچھ نہیں کر سکتے! یا للعجب!!

ترمذی میں ہے فقراء اغنیاء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے.

(جامع ترمذی اردو، جلد دوم، صفحہ ۲۰، مطبوعہ دار الاشاعت، کراچی).

ابنِ ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ کو مسکنت اور مساکین اس قدر محبوب تھے کہ آپ دعا مانگا کرتے تھے کہ ؛ اللّٰھم احینی مسکینا و توفنی مسکینا و احشرنی فی زمرۃ المساکین (یااللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین ہی مار۔ اور میرا حشر بھی مسکینوں کے ساتھ کر)۔

مسکنت ایسی چیز ہے جسے قرآن نے خدا کا عذاب بتایا ہے، جب یہودیوں کے متعلق کہاکہ وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ.......

بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایاکہ میں تمہیں اہلِ جنت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کمزور اور حقیر اور ضعیف مسلمان وہ جنتی ہیں کہ اگر اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کو ضرور سچا کر دے۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی جلد ششم صفحہ ۳۱۰)

طبرانی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایاکہ میری اُمت میں وہ لوگ بھی ہیں کہ اگر وہ تم سے ایک پیسہ مانگیں، تو تم انہیں نہ دو۔ لیکن اگر اللہ سے جنّت مانگیں تو اللہ انہیں جنت دے دے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے کپڑے میلے کچیلے، بال پریشان، مفلسی کے مارے بالکل شکستہ حال لیکن اگر خدا پر قسم کھا بیٹھیں تو خدا ان کی قسم کو پورا کر دے۔

یوں مفلسی، تنگدستی، پریشان حالی، بیچارگی، ناتوانی، محکومیت اور محتاجی مسلمانوں کے لئے صفاتِ حسنہ بنادی گئیں اور یہ چیز ان کے ذہن میں راسخ کر دی گئی کہ مصیبتیں اور پریشانیاں گناہوں کا کفّارہ ہوتی ہیں۔ (اس موضوع پر تمام روایات صحیح مسلم مع شرح نووی، جلد ششم صفحہ ۳۰۹ اور آگے مطبوعہ نعمانی کتب خانہ، لاہور پر موجود ہیں)۔

مصیبتیں گناہوں کا کفّارہ بن جاتی ہیں

چنانچہ مسند امام احمد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایاکہ جب کسی بندے کے گناہ بہت ہوجاتے ہیں اور کوئی عمل ایسا نہیں ہوتا جن سے گناہوں کا کفارہ ہوسکے تو اللہ تعالیٰ اس کو رنج و مصائب میں مبتلا کرتا ہے۔ اور یہ مصائب اس کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتے ہیں۔

حتّٰی کہ بیماری بھی

طبرانی میں ہے کہ جب کوئی مومن بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو گناہوں سے ایسا پاک کر دیتا ہے جیسے بھٹی لوہے کو زنگ اور میل کچیل سے پاک و صاف کر دیتی ہے۔

بخاری میں ہے کہ جب بندہ بیمار ہوتا ہے یا سفر میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ بیماری اور سفر سے اس بندے کے اعمال میں کمی ہورہی ہے اسے پورا لکھتے جاؤ۔

مسند امام احمد میں ہے کہ بیمار کی خطائیں اس طرح گرجاتی ہیں جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے

گر جاتے ہیں۔ مومن اگر تندرست ہوتا ہے تو گناہوں سے پاک ہو کر تندرست ہوتا ہے اور اگر مر جاتا ہے تو مرحوم و مغفور ہو کر مرتا ہے۔

بخار سے جنت

ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ بخار اور درد سر سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، خواہ یہ گناہ اُحد کے پہاڑ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔ (ابو یعلیٰ)۔ حتیٰ کہ "ایک دن کا بخار بھی مومن کے تمام گناہوں کو دُور کر دیتا ہے۔" (ابن ابی الدنیا)

اندھا

بخاری میں ہے کہ جب اللہ کسی بندے کی آنکھیں لیتا ہے تو اسے اس کے بدلے میں جنت دے دیتا ہے۔

خلوت گزینی

قرآن نے جماعتِ مومنین کے متعلق فرمایا تھا کہ ہم نے انہیں امتِ وسطیٰ بنایا ہے۔ لتکونوا شھداء علی الناس۔ تاکہ یہ تمام نوعِ انسان کے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں اور جو ذرا بھی عدل کے راستے سے ہٹنے لگے اُسے فوراً سیدھی راہ پر لے آئیں۔ لیکن روایات یہ بتاتی ہیں کہ خدا کے مقرب وہ ہیں جو گھروں کے اندر خلوت میں بیٹھے رہتے اور اپنی خطاؤں پر روتے رہتے ہیں چنانچہ ترمذی میں ہے کہ کسی نے حضورؐ سے پوچھا کہ نجات کس میں ہے، فرمایا کہ اپنی زبان کو بند رکھ، اپنی خطاؤں پر رو اور گھر میں بیٹھ رہ۔

ابو داؤد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ وقت آئے گا کہ لوگوں میں وعدہ اور اقرار کا وزن گھٹ جائے گا۔ امانت کی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔ انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر حاضرین کو بتایا کہ فتنے اس طرح ایک دوسرے سے گتھ جائیں گے جس طرح بوریا بُنا جاتا ہے۔ ابنِ عباسؓ نے کہا کہ ایسے وقت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ فرمایا اپنے گھر میں بیٹھ جا اور اپنی جان پر رویا کر۔ نیکی کو اختیار کر، بدی کو چھوڑ، اپنی جان کو دوزخ سے بچا اور پبلک زندگی سے علیحدہ ہو جا۔ (سنن ابو داؤد اردو، جلد سوم، صفحہ ۳۷۴ - ۳۷۵، مطبوعہ نعمانی کتب خانہ، لاہور)۔

بلکہ یہاں تک بھی کہ شہروں کو چھوڑ کر جنگل میں چلے جانا چاہیئے کیوں کہ حدیث میں ہے کہ جماعت کی نماز کا ثواب پچیس نمازوں کے برابر ہے۔ لیکن جنگل میں لوگوں سے علیحدہ ہو کر نماز ادا کرنے کا ثواب پچاس نمازوں کے برابر ہے۔ (ایضاً جلد سوم، صـ۳۴۲)

یہ وہی رہبانیت کی زندگی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ یعنی یا تو جنگلوں میں چلے جاؤ۔ اور اگر شہر میں رہو تو اپنے اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے رہو اور "خدا کے خوف سے روتے رہو"۔ چنانچہ بیہقی کی روایت

ہے کہ ایک دن حضورؐ وعظ فرما رہے تھے۔ ایک شخص وضو میں رونے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کے پاس بیٹھنے والے بھی سب بخش دیئے گئے۔ خواہ ان کے گناہ مثل پہاڑ کے بھی کیوں نہ ہوں۔ اسی میں ایک انصاری کا واقعہ لکھا ہے کہ اس پر خدا کا خوف اس قدر غالب آگیا کہ ہر وقت رویا کرتا تھا۔ حضورؐ نے جب اس کا ذکر سنا تو اس کے مکان پر تشریف لے گئے اور جا کر اسے گلے سے لگایا۔ انصاری پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ مر کر گر پڑا۔ (بیہقی)

جنازے سے جنت

مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر کسی میت کی نمازِ جنازہ میں چالیس آدمی شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ جس میت پر مسلمانوں کی تین صفیں نماز پڑھتی ہیں اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے اور بخاری میں ہے کہ اگر کسی میت کو چار یا تین یا دو آدمی بھی اچھا کہہ دیں تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی جلد دوم صفحہ ۳۸۶ مطبوعہ نعمانی کتب خانہ لاہور)

اور اگر یہ بھی نہ ہو تو...

اور آگے بڑھئے۔ بیہقی کی روایت ہے کہ ایک بندے کو ارشاد ہو گا آگ میں داخل ہو جا۔ وہ دوزخ کے کنارے پہنچ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے گا۔ اور کہے گا کہ خدا کی قسم مجھے خدا سے اچھی امید اور بھلائی کا گمان ہے۔ ارشاد ہو گا اسے لوٹا لاؤ۔ میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوں۔

مختصراً یہ ہیں طریقے اس جنت کو حاصل کرنے کے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ اس کی راہ میں ایسے جانگداز مراحل آتے ہیں کہ اور تو اور خود رسولؐ اور اس کے رفقائے کار گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگ جاتے ہیں یہ جنت نتیجہ تھی اس انقلابِ عظیم کا، جس کی رو سے دنیا کے ہر مفاد پرست گروہ کے ہاتھوں سے اقتدار چھین کر، تمام اختیارات قانونِ خداوندی کے ہاتھ میں آجاتے تھے۔ اور کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا محکوم رہتا تھا نہ محتاج۔ اس انقلاب میں نہ قیصر کی شوکت باقی رہتی تھی، نہ کسریٰ کی سطوت۔ نہ نظامِ خانقاہیت کی روباہ بازیوں کو اذنِ فریب دہی مل سکتا تھا نہ احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو اپنی سیادت و قیادت قائم کرنے کی اجازت۔ یہ نظام ان تمام مفاد پرست جماعتوں کے خلاف اعلانِ جنگ تھا اس لئے انہوں نے اسلام کے ہاتھوں شکست کھائی تو اس قسم کی روایات وضع کر کے عام کر دیں۔ یہاں تک کہ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ:۔

اگر گناہ نہ کرو گے تو...

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے

اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلبگاری کرے۔ (مسلم عن ابوہریرہؓ) (جامع ترمذی جلد دوم، صفحہ ۲۷۹، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، دین کا منتہائے مقصود جنّت کا حصول ہے۔ اس کے لئے ایک مسلمان کو ساری عمر مجاہدانہ زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ جماعتِ مؤمنین کے یہی وہ اعمالِ حیات ہیں جو خود ان کے معاشرے میں، اور اس کے بعد، عالمگیر انسانیت میں انقلابِ عظیم برپا کرتے ہیں۔ اب آپ سوچئے کہ جب مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دی جائے کہ اگر انہوں نے گناہ نہ کئے تو خدا ان کی جگہ اور قوم لے آئے گا، تو اس قوم کے معاشرے کی حالت کیا ہو گی۔ اور اگر وہ نیک اعمال کرنے کے لئے تیار بھی ہو جائیں تو انہیں حصولِ جنت کی اس قدر آسان ترکیبیں بتا دی جائیں تو ان میں مجاہدانہ حرارت کہاں باقی رہے گی؟ یہی وہ حقیقت ہے جسے خون کے آنسوؤں کے ساتھ علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں کہا ہے کہ ؎

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے	شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل	یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست	یہ مذہبِ مُلا و جمادات و نباتات

آج اس "مذہبِ ملا و جمادات و نباتات" کی تمام تر سندیں اسی قسم کی وضعی روایات ہیں جو سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکی ہیں۔ اور یہی وہ روایات ہیں جن کے انکار پر مُلا کی طرف سے کفر سے فتوے صادر کر دیئے جاتے ہیں۔

چند نامور اہلِ فکر و علم کے نزدیک

حدیث کا مقام

علامہ اقبالؒ کے نزدیک احادیث کا مقام کیا ہے، اس کے متعلق باب اوّل میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ وہیں یہ حقیقت بھی سامنے آگئی تھی کہ (علامہ اقبالؒ کے بیان کے مطابق) امام ابو حنیفہؒ اور شاہ ولی اللہ کا نظریہ کیا تھا، اس سلسلہ میں، ذیل میں دو چار دیگر نامور اہلِ علم و فکر حضرات کے خیالات پیش کئے جاتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (علیہ الرحمتہ) کا نامِ نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی حکمتِ ولی اللّٰہی کے بہت بڑے شارح، مفکر اور مبلغ سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے (غالباً ۱۹۴۱ء میں) رسالہ الفرقان کے "ولی اللہ نمبر" میں ایک مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا۔ جس میں بتایا تھا کہ حکمتِ ولی اللّٰہی کی رُو سے حدیث کا صحیح مقام کیا ہے۔ ہم اس مقالہ کے جستہ جستہ اقتباسات درج ذیل کرتے ہیں:

آپ نے اس باب میں جو "حدیث کی صحیح پوزیشن" کے عنوان سے سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکا ہے، دیکھا ہوگا کہ احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق نبیٔ اکرمؐ کے زمانے کے حالات و کوائف سے ہے اور دوسرا وہ جن میں احکامات دیئے گئے ہیں۔ جہاں تک دین پر عمل کرنے کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ یہ حصّہ بہت اہم ہے۔ کیوں کہ کہا یہ جاتا ہے کہ جس طرح قرآن کے احکام غیر متبدل ہیں اسی طرح احادیث کے یہ احکام بھی غیر متبدل ہیں اور ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح عمل ہوتا رہنا چاہیئے۔ آپ دیکھئے کہ مولانا سندھیؒ (حکمتِ ولی اللّٰہی کی روشنی میں) اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانونِ اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سُنّت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورہ سے تجویز کئے۔ خلافتِ عثمانیہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے طے کئے جائیں۔ سنّت کو ہمارے فقہائے حنفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں۔ اور یہی ہماری رائے ہے۔ اور یہ سنّت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آجکل کی اصطلاح میں اس کو بائیلاز کہا جاتا ہے۔ اصل قانونِ اساسی متعیّن ہے۔ بائیلاز اُس وقت اور تھے اِس وقت اور ہوں گے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اس کا نام فقہ ہے۔" (ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۲۶۴)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین نے حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں باہمی مشاورت سے قرآن کریم کی روشنی میں جو تمہیدی قوانین (بائیلاز) مرتب فرمائے، ان کا نام سنّت ہے۔ یعنی اس زمانے کی فقہ۔ یہ بائیلاز ہر زمانہ میں بدلتے رہیں گے۔ لیکن اصل قانون (قرآن کریم) اساسی حیثیت سے مستقل رہے گا۔

احادیث کی پوزیشن اناجیل کی سی ہے

قرآن کریم نے کتبِ سابقہ کو محرّف قرار دیا ہے۔ یعنی وہ کتابیں اس شکل میں باقی نہیں رہیں جس شکل میں انہیں خدا کے رسولوں نے اپنی اپنی امت کو دیا تھا۔ موجودہ اناجیل کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد، آپ کے حواریوں نے مرتب کی تھیں۔ مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ کتبِ احادیث کی حیثیت اناجیل کی سی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب اناجیل کو ہم حضرت عیسیٰؑ کے ارشادات قرار نہیں دے سکتے تو احادیث کس طرح یقینی طور پر ارشاداتِ نبویؐ قرار دی جا سکتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

ان لوگوں کی اصطلاح پر اگر کتبِ مقدسہ سابقہ کو کتبِ احادیث کا درجہ دے دیا جائے تو بطریقِ ادنیٰ اس کو مستبعد نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر یہ لوگ اس بات کو تسلیم کرلیں تو تمام اشکال حل ہو

> جائیں (۱) ہماری کتبِ حدیث میں بالاتفاق غیر صحیح روایات بھی موجود ہیں (۲) نیز ان کتبِ حدیث میں ایک واقعہ کو مختلف طریقوں سے بھی روایت کیا گیا ہے (۳) ہماری بہت سی کتبِ حدیث میں کاتبوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جن کو محققین علماء درست کرتے رہتے ہیں۔
> اس کے بعد اگر اناجیل اربعہ کو ہماری صحاح اربعہ (صحیحین، ابوداؤد، ترمذی) کے درجہ پر رکھ دیا جائے تو ذرہ برابر اختلاف نظر نہیں آئے گا۔ (ایضاً ص ۲۶۷-۲۶۶)

یعنی وحی تمام کی تمام قرآن پاک کے اندر محصور ہو چکی ہے۔ اس کے باہر کہیں نہیں۔ پھر جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے آپؑ کی سیرت لکھی جس میں آپ کے اقوال و اعمال کو اپنی انفرادی کوشش سے جمع کیا۔ اسی طرح مسلمان ائمۂ تاریخ و روایات نے نبیِ اکرمؐ کی سیرت اور حضورؐ کے عہدِ مبارک کی تاریخ مدوّن کی، تاریخ و سیرت کی ان کتابوں کا نام جو اس طرح کی روایات پر مشتمل ہیں، کتبِ احادیث ہے۔ نہ یہ وحی ہیں نہ وحی (قرآن) کی طرح محفوظ، اور اس لئے یقینی نہیں ہیں، جس طرح کتبِ اناجیل یقینی نہیں ہیں۔ جناب سندھی کے مضمون کے حاشیہ میں خود شاہ صاحبؒ کی عبارت درج ہے جس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے۔ (عبارت فارسی میں ہے)۔

> کتابِ الٰہی کے لئے دو چیزیں لازم ہیں۔ اوّل ملکوت کی برکتیں اور ملاءِ اعلیٰ کی خوشنودی اور پسندیدگی، ہر اس شخص کے لئے جو کتاب کی تلاوت کرے اور اس کی اشاعت میں کوشش کرے۔ دوسرے طویل زمانوں کے گزر جانے پر بھی اس کتاب کا باقی رہنا اور امت کے لئے اس کے حفظ کرنے کی توفیق حاصل ہونا۔ اگر یہ دو باتیں نہ پائی جائیں تو وہ کتابِ الٰہی نہ ہو گی۔ بلکہ انسانوں میں سے کسی فرد کی تالیف ہو گی جس نے اپنے ارادے سے علمِ پیغمبر کو جمع کیا جیسے ہمارے دین میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں۔" (ایضاً: ص ۲۲۵)

مولانا سندھیؒ کے الفاظ میں "اس طرح انبیاءؑ کی سیرتوں کو جمع کرنا پہلے زمانے میں بھی رائج رہا۔ (ص ۲۶۵)۔ لہٰذا، کتبِ احادیث درحقیقت کتبِ تاریخ ہیں۔ اور کتبِ تاریخ میں ہر طرح کی روایات درج ہوتی ہیں۔

مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں:

صحاح ستہ میں غلط روایات کا اختلاط

میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) کے مقدمۂ مشکوٰۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اور شیخ صاحب نے ان سب کو ایک درجہ پر رکھا ہے۔ وہ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں جس طرح باقی کتب میں تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہوگئی۔" (ایضاً صـ۲۶۸)

ضعیف روایات متواتر کیسے بن جاتی ہیں

آپ مختلف طبقات کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان کے سوا بعض ایسے محدثوں نے بھی کتابیں تصنیف کیں جن کی لیاقتِ علمی بھی مسلّم نہیں ہے۔ متاخرین محدثین نے ان غیر معتبر کتابوں کی روایتیں زوائد کے نام سے جمع کر دیں۔ جس سے علمِ حدیث میں فتنے کا دروازہ کھل گیا۔ اس ذخیرہ میں کافی سے زیادہ روایتیں ایسی موجود ہیں جن کو دوسرے طبقہ کا مصنف ضعیف قرار دیتا ہے اور ان طبقات (یعنی تیسرے چوتھے اور پانچویں) میں پہنچ کر ان متاخرین کے نزدیک وہ حدیث متواتر بن جاتی ہے۔

اس کے بعد آپ نے ایک حدیث کی مثال دے کر لکھا ہے:

ترمذی نے اس حدیث کی تضعیف کر دی۔ اب مستدرک حاکم کو دیکھئے۔ وہ اس جملہ مضاعفہ کو تیس چالیس سندوں سے روایت کرتا ہے۔ ایک غیر محقق عالم اس کثرتِ اسانید سے متاثر ہو کر اس کی صحت یا اس کے درجۂ شہرت اور تواتر پر یقین کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ہم نے حاکم کی ان روایات کی تنقید فتح الباری کی امداد سے شروع کی تو ان میں سے ایک اسناد بھی صحیح نہ نکلی۔" (ایضاً صـ۲۷۵)

صحیح بخاری کی ضعیف روایات

اس کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں:

تھوڑی تھوڑی غلطیاں ہر مصنف سے ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ امام بخاری جو سب سے زیادہ متیقن مانے جاتے ہیں، ان کی کتاب میں حافظ ابنِ حجر چالیس کے قریب ایسی احادیث مانتے ہیں جن کی اسانید ضعیف ہیں اور حافظ صاحب

کے پاس بھی ان کا کوئی حل نہیں۔" (صلا۲۷). حاشیہ میں ہے۔ "یوں تو حافظ ابنِ حجر نے صحیح بخاری میں سو کے قریب معلّل روایتیں نکالی ہیں، پھر ان خدشات کے جوابات بھی بیان کئے ہیں. مگر چالیس کے قریب روایات کا ضعف ان کے نزدیک اس درجہ کا ہے کہ باعترافِ حافظ اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔"

صحیح اور ضعیف احادیث کا معیار

متشدّد فی الحدیث طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ موجودہ مجموعہ احادیث میں حدیثوں کی جو تقسیم ہو چکی ہے وہ اٹل ہے۔ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ جسے صحیح قرار دیا جا چکا ہے، وہ صحیح، جسے ضعیف کہہ دیا گیا ہے وہ ضعیف۔ یعنی اسے تقلیداً ماننا پڑے گا۔ قرآن کریم کی روشنی میں اپنی سمجھ سے آپ کچھ نہیں کر سکتے۔

جناب سندھیؒ فرماتے ہیں :-

یہ خرابی جو عام اذہان پر مستولی ہے، اس کی تہ میں یہ مرض پنہاں ہے کہ حدیث کے فن کو خصوصاً تصحیح اور تضعیف کو تقلیداً اخذ کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا عالم جو اپنی سمجھ سے صحیح حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہو، آج پیدا ہونا متعذر ہو گیا ہے[۱]. اسماء الرجال میں توثیق و تضعیف کا اختلاف، پھر صحیح حدیث کی تعریف میں مختلف آراء، طالب العلم میں یکسوئی سے کوئی ملکہ پیدا ہونے نہیں دیتیں۔ آخر مجبور ہو کر فقہا کا جو متوارث مسلک ہے اسی میں راجح و مرجوح کی تمیز پیدا کرنے کے بعد، جو حدیث اس مسلک کے موافق ہو اسے صحیح اور جو مخالف ہو اس کو ضعیف بنانے کی استعداد حاصل ہونے پر طالب العلم اپنا سفر ختم کر دیتا ہے۔" (ایضاً صد۲۷۹)

اور اس کے بعد دین کا واحد ٹھیکہ دار بن جاتا ہے۔ جسے چاہے مسلمان سمجھے جسے چاہے کافر قرار دے دے۔

صحیح بخاری کی بعض احادیث

جیسا کہ معلوم ہے، ہماری کتب احادیث میں ایسی ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں نبیَ اکرمؐ کی طرف منسوب کرتے

---

[۱] جو اس کا دعوےٰ کرتے ہیں ان پر کفر کے فتوے عائد کر دیئے جاتے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

ہوئے دل کانپ اٹھتا ہے۔ دیکھئے! مولانا سندھیؒ اس باب میں کیا فرماتے ہیں؛

”جس قدر میری توجہ قرآن کی طرف بڑھتی گئی اور نوجوانوں کو بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہوتا گیا اسی قدر میرے سابقہ یقین میں تزلزل پیدا ہونے لگا۔ میں اس کا کبھی قائل نہیں ہوا کہ دینی تعلیم اگر عربی مدارس کے طلباء کو دی جائے تو اطمینان بخش ہو اور اگر وہی دینی تعلیم کالج کے طلباء کو دی جائے تو اطمینان پیدا نہ کر سکے۔ اگر ایسا ہو تو وہ تعلیم حقیقی اسلام کی تعلیم نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ قرآن ساری دنیا کے لئے نازل ہوا ہے۔ اگر کالج کے طلباء کو ہم قرآن کی تعلیم اس طریقے پر (جو عربی مدارس میں کامیاب ثابت ہو) نہیں دے سکتے تو غیر مسلم لوگوں کو ہم کیا پڑھا سکتے ہیں۔ رہا یہ کہ بخاری میں میرے اشکالات کیا ہیں اور میں ایک یورپین نومسلم کو وہ کتاب کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ ان تفاصیل پر میں مجالس عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں۔ اہلِ علم جو تکمیل کر چکے ہیں، یا تکمیل کے قریب ہیں، ان سے میں مذاکرات میں سب کچھ کہہ دوں گا۔　　　(ایضاً صفحہ ۸۷ - ۲۸۵)

مولانا حمید الدین فراہیؒ و سید سلیمان ندویؒ

مولانا حمید الدین فراہیؒ ہمارے دور کے بڑے صاحبِ فکر قرآنی عالم تھے، وہ اپنی تصنیف ”نظام القرآن“ میں حدیث کے متعلق لکھتے ہیں؛۔

یاد رہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے ...... حدیث، اجماع اور صحفِ اولیٰ یہ تینوں ظن و شبہ سے خالی نہیں .... میں نے بعض روایات دیکھی ہیں جو آیتوں کو جڑ سے اکھاڑ دیتی ہیں .... اکثر اہلِ حدیث کے دلوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ بخاری اور مسلم نے جو کچھ روایت کر دیا اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ پس ہم بعض قابلِ اعتراض مقامات لکھتے ہیں تاکہ تم سمجھ سکو کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو رب ٹھہرانے کی شناعت فرمائی ہے۔ پس ہم ان کے غیر معقول فکر و فہم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں۔“ (نظام القرآن، مطبوعہ دارالاصلاح لکھنؤ)

فروری ۱۹۴۲ء کے معارف (اعظم گڑھ) میں علامہ حمید الدین فراہیؒ اور علمِ حدیث کے متعلق ان کے شاگرد

مولوی امین احسن صاحب اصلاحی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس پر مدیر معارف، سید سلیمان ندوی (مرحوم) نے کوئی اختلافی نوٹ نہیں لکھا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی ان کے خیالات سے متفق تھے، غور فرمایئے کہ انہوں نے اس مضمون میں کیا لکھا تھا:

> دوسری بات یہ ہے کہ مولانا ان لوگوں کے خیال سے بھی اتفاق نہیں رکھتے جو بخاری و مسلم کی تمام مرویات کو ظن سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اور یہ بات مولانا نے کوئی نئی اور عجیب نہیں لکھی ہے۔ حافظ ابنِ حجر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی ان کتابوں کو ظن سے بالاتر نہیں سمجھتے۔ ظن سے بالاتر تو سماء دنیا کے نیچے صرف ایک ہی کتاب ہے۔ (ماہنامہ معارف صفحہ ۹۵-۹۴)

اس کے بعد ارشاد ہے:۔

> بس ہم کو صرف وہ روائتیں قبول کرنی چاہئیں جو قرآن کی تصدیق و تائید کریں..... جب قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو تو اس وقت حَکَمْ قرآن ہوگا۔ (ماہنامہ معارف، ص ۹۱-۹۲، اعظم گڑھ لکھنؤ)

صفحہ ۹۰ پر ارشاد ہے:۔

> یہاں مولانا نے بے شبہ یہ فرمایا ہے کہ احادیث میں ظن و شبہ کو دخل ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ (ایضاً)

لیجئے احادیث میں ظن و شبہ کے باب میں معاملہ علامہ فراہیؒ، مولوی امین احسن اصلاحی اور سید سلیمان ندویؒ تک ہی محدود نہ رہا، بلکہ ان حضرات کے قول کے مطابق یہ ایک ایسا مسلّمہ امر ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔

مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم)

مولانا گیلانی (مرحوم) کی کتاب "تدوینِ حدیث" کے بعض اقتباسات اس سے پہلے دیئے جا چکے ہیں۔ وہ اس ضمن میں کہ احادیث درحقیقت عہدِ نبیِ اکرمؐ و صحابہؓ کی تاریخ ہے، لکھتے ہیں:۔

> فنِ حدیث کے سب سے بڑے امام، امام الائمہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کا نام جو رکھا ہے اگر اُسی پر غور کر لیا جائے تو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ سمجھنے والوں نے ہمیشہ اس فن کو اسی نگاہ دیکھا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب آج تو صرف بخاری شریف کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن یہ اس کتاب کا نام نہیں ہے بلکہ خود حضرت امامؒ نے اپنی کتاب کا نام "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ وسلّم وایامہ" رکھا ہے۔ اس میں امور اور ایام کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام امور کو حاوی ہے۔ جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے تعلق ہو۔ آگے ایام کے لفظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کر دیا۔ یعنی وہی بات جو میں نے عرض کی تھی کہ فنِ حدیث دراصل اس عہد اور زمانہ کی تاریخ ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جیسی ہمہ گیر، تمام عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی، انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی۔ بہرکیف اگر اصطلاحی جھگڑوں سے الگ ہو کر پھل سے درخت کو پہچاننے کے اصول کو مدِ نظر رکھا جائے تو حدیث کے موجودہ ذخیرہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد بھی ایک معمولی آدمی اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ حدیث کی صحیح حقیقت اور اس کی واقعی تعریف وہی ہو سکتی ہے جس کی طرف امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کے نام میں اشارہ فرمایا ہے اور میں نے جس کی تشریح کی ہے۔

(تدوینِ حدیث[1]، صفحہ ۳۸۳-۳۸۴)

اس میں وضاحت سے درج ہے کہ خود امام بخاریؒ اور مولانا گیلانیؒ کے نزدیک صحیح بخاری رسول اللہؐ کے عہد مبارک کی تاریخ ہی ہے۔ اور یہی کیفیت دیگر کتبِ احادیث کی ہے۔

[1] یہ کتاب شروع میں دار المعارف اعظم گڑھ کی جانب سے شائع ہوئی تھی۔ بعد میں نفیس اکیڈمی کراچی سے اس کی فوٹو کاپی شائع کی گئی تھی۔

امام ابوحنیفہؒ اور حدیث

امام ابوحنیفہ (علیہ الرحمۃ) کا اسمِ گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں. فقہ میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ باب اوّل میں علامہ اقبالؒ کے حوالے سے یہ بتایا جاچکا ہے کہ امام صاحب کا مسلک حدیث کے بارے میں کیا تھا. زیرِ نظر باب میں اُسی اجمال کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

امام اعظمؒ نے تدوینِ فقہ میں حدیثوں سے بہت کم مدد لی

قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں جزئیات مرتب کرنے کو فقہ کہتے ہیں. دورِ صحابہؓ میں فقہ کے کوئی خاص اصول مدوّن نہیں ہوئے تھے اس باب میں سب سے پہلے اور نہایت کامیاب کوشش امام ابوحنیفہؒ کی ہے جو امت میں امامِ اعظمؒ کے لقب سے متعارف ہیں. اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا صحیح مقام بھی یہی تھا. وہ فنِ فقہ کے امام تھے اور بہت بڑے امام. ان کی طرف منسوب فقہ پر آج عمل ہوتا چلا آ رہا ہے اور اس وقت بھی دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت اسی فقہ کی تقلید کرتی ہے. اس حقیقت سے ہر صاحبِ علم واقف ہے کہ امام اعظمؒ کی فقہ کا دار و مدار قیاس پر ہے. قیاس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے جزئیات مرتب کریں. اہلِ علم حضرات سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں کہ امام اعظمؒ نے اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے بہت کم مدد لی ہے. اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہیں حدیثیں مل نہیں سکتی تھیں. وہ ایک قول کے مطابق ۶۱ھ میں اور دوسرے کے مطابق ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ تک زندہ رہے اور اس دَور میں حدیثوں کا جمع کرنا اس زمانے سے آسان تھا جس زمانے میں امام بخاری

(متوفی ۲۵۶ھ) نے یہ کام کیا۔ جہاں تک احادیث کی پہچان کا تعلق ہے محمد بن سماعہ کہتے ہیں کہ میں نے امام یوسفؒ کو کہتے ہوئے سُنا کہ میں اکثر احادیث کی طرف مائل ہو گیا ہوں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ابوحنیفہ کو صحیح حدیث کی پہچان مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔ (تاریخِ بغداد از ابوبکر خطیب، صفحہ ۳۴۰، ج ۱۳) اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نہ تو حدیث کو وحیِ الٰہی کی طرح غیر متبدل سمجھتے تھے اور نہ ہی شک و شبہ سے بالا۔ وہ دین کی بنیاد سرتاپا یقینیات پر قائم سمجھتے تھے۔ اور یقینی دین صرف کتاب اللہ کے اندر محصور تھا۔ چنانچہ علی ابن المدینی عبدالرزاق سے نقل کرتے ہیں کہ میں معمر کے پاس بیٹھا تھا کہ عبداللہ ابن المبارک آ گئے تو ہم نے معمر کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ میں ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں جو ابوحنیفہؒ سے زیادہ بہتر طور پر فقہ میں کلام کر سکے اور عقل و قیاس سے کام لے سکے، اور مخلوق کے لئے فقہ میں نجات کی راہ کو کھول کر بیان کر سکے، اور خدا کے دین میں شک و شبہ کی کوئی بات داخل کرنے سے ابوحنیفہ سے زیادہ ڈرنے والا ہو (ایضاً صفحہ ۳۳۹، ج ۱۳)۔ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں اپنے اجتہاد اور اہل الرائے کے مشورہ سے فقہ کی تدوین کرتے۔ اس کے بعد اگر کوئی یہ کہتا کہ آپ کا فیصلہ رسولؐ اللہ کی حدیث کے خلاف ہے تو وہ اس کے جواب میں یہی کہتے جو حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ رسولؐ اللہ کا وہ فیصلہ اُس زمانے کے لئے تھا اب حالات بدل چکے ہیں اس لئے اس فیصلہ میں تبدیلی ہونی ضروری ہے یا وہ حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابہؓ کے اتباع میں یہ کہتے کہ کیا معلوم رسولؐ اللہ نے کیا فرمایا تھا اور سننے والے نے اسے کیا سمجھا۔ ہم کتاب اللہ کی موجودگی میں اس قسم کی غیر یقینی چیزوں کو دین کا حصہ نہیں قرار دے سکتے۔ چونکہ وہ اس حقیقت کو نمایاں کر دینا چاہتے تھے کہ احادیثِ رسولؐ اللہ نہ تو یقینی ہیں اور نہ غیر متبدل، اس لئے بعض اوقات حدیث کے رد میں شدت تک بھی اختیار کر لیتے تھے۔

امام سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ سے زیادہ کسی کو اللہ پر جراٗت کرنے والا نہیں دیکھا

امام ابوحنیفہؒ احادیث کو ناقابل تبدیل نہیں سمجھتے تھے اور ضرورت پڑنے پر سختی کے ساتھ ردّ کر دیا کرتے تھے

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے لئے مثالیں بیان کیا کرتے اور ان کو ردّ کر دیا کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کو معلوم ہوا کہ میں یہ حدیث نقل کرتا ہوں؛ ان البیعان بالخیار مالم یتفرقاً (بائع اور مشتری جب تک علیحدہ نہ ہو جائیں انہیں معاملہ فسخ کر دینے کا اختیار رہتا ہے) ابوحنیفہؒ کہنے لگے ۔۔

ذرا بتاؤ تو سہی۔ اگر دونوں کسی ایک کشتی میں سفر کر رہے ہوں۔ اگر دونوں قید خانہ میں ایک ساتھ ہی قید ہوں۔ اگر دونوں ایک ساتھ ہی کسی سفر میں ہوں۔ تو کس طرح جدا ہوں گے (اور کیونکر ان کا معاملہ تکمیل پذیر ہوگا) مفضل بن موسیٰ سینانی کہتے ہیں کہ میں نے خود ابوحنیفہ کو کہتے سنا ہے کہ میرے ساتھیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دو قلے پیشاب کر دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے نبی صلعم کی اس حدیث کو کہ "پانی اگر دو قلے ہو تو وہ نجس نہیں ہوتا" کو رد کرتے ہوئے ایسا فرمایا تھا۔ (ایضاً، ج ۱۳، ص ۳۸۹)

امام اعظمؒ نے چار سَو سے زیادہ احادیث کو ردّ کیا

ابو صالح فزار کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "امام ابوحنیفہؒ نے رسول اللہ صلعم کی چار سو سے بھی زیادہ حدیثوں کو رد کر دیا ہے" میں نے یوسف سے پوچھا۔ اے ابو محمد! آپ کو وہ حدیثیں معلوم ہیں کہنے لگے ہاں معلوم ہیں۔ میں نے کہا تو مجھے کچھ حدیثیں بتایئے۔ یوسف بن اسباط نے کہا کہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ "مالِ غنیمت میں گھوڑے کے دو حصے اور پیادہ آدمی کا ایک حصہ ہے۔" مگر ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ میں ایک جانور کا حصہ ایک مومن کے حصہ سے زیادہ نہیں کر سکتا۔" حضور اکرم صلعم اور آپ کے اصحاب نے برابر قربانی کے جانوروں پر نیزہ مار کر نشان لگایا ہے۔ مگر ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ "ایسا کرنا ایک جانور کی صورت کو بگاڑنا ہے۔" رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ "جب تک فروخت کرنے والا اور خریدار جدا نہ ہوں ان کو بیع فسخ کرنے کا اختیار رہتا ہے۔ مگر ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ جب معاملہ ہو چکا تو پھر کوئی اختیار نہیں رہتا۔" رسول اللہ صلعم کہیں سفر میں تشریف لے جاتے تو ہمراہ لے جانے کے لئے ازواجِ مطہراتؓ کے درمیان قرعہ اندازی فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ کے اصحابؓ کا بھی اسی پر عمل رہا۔ مگر ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ قرعہ اندازی خالص قمار اور جوا ہے۔

ابو صائب کہتے ہیں کہ میں نے (حدیث کے مشہور امام) وکیع کو کہتے ہوئے سُنا کہ ہم نے ابوحنیفہؒ کو دو سو حدیثوں کی مخالفت کرتے ہوئے پایا ہے۔" عبد الاعلیٰ بن حماد اپنے والد حماد بن سلمہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابوحنیفہ کے سامنے رسولؐ اللہ کی حدیثیں آتی تھیں مگر وہ اپنی رائے سے ان کو رد کر دیا کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی مؤمل کے واسطہ سے حماد بن سلمہ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ (ایضاً، ج ۱۳، صفحہ ۳۹۰-۳۹۱)۔

انکارِ حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کا تشدد

ابو اسحاق فزاری کہتے ہیں کہ میں ابوحنیفہؒ کے پاس جا کر مسائل جہاد کے متعلق سوالات کرتا

تھا ایک دن میں نے ایک مسئلہ پوچھا۔ ابوحنیفہؒ نے اس کا جواب دیا۔ اس پر میں نے کہا کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد تو اس طرح ہے۔ ابوحنیفہؒ نے کہا "ہمیں اس سے معاف رکھو۔" ایسے ہی ایک دن میں نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا جس کا انہوں نے جواب دیا۔ میں نے پھر کہا کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے تو ایسا منقول ہے تو ابوحنیفہؒ نے کہا "اسے لے جاکر خنزیر کی دم سے رگڑ دو۔" ابو اسحاق فزاری کہتے ہیں کہ میں نے بادشاہِ وقت کے خلاف خروج (بغاوت) کے ناجائز ہونے پر ابوحنیفہؒ کے سامنے ایک حدیث بیان کی تو ابوحنیفہؒ کہنے لگے کہ یہ حدیث خرافات میں سے ہے۔ علی ابن عاصم کہتے ہیں کہ ہم نے ابوحنیفہؒ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث سنائی تو ابوحنیفہؒ نے کہا کہ میں اسے قبول (تسلیم) نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔ ابوحنیفہؒ نے پھر کہا۔ ہاں ہاں میں اس کو قبول نہیں کرتا۔

(تاریخ بغداد، مصنف ابوبکر خطیب، جلد ۱۳، ص۳۸۷)

بشر بن المفضل کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ سے بیان کیا کہ نافعؒ ابنِ عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی صلعم نے ارشاد فرمایا کہ بائع اور مشتری (فروخت کنندہ اور خریدار) جب تک جدا نہ ہو جائیں انہیں فسخ بیع کا اختیار رہتا ہے۔ ابوحنیفہؒ نے کہا کہ یہ تو محض ایک رجز (جنگی گیت) ہے۔ میں نے کہا کہ قتادہؒ حضرت انسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تھا تو رسول اللہ صلعم نے بھی اس یہودی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا۔ ابوحنیفہؒ نے کہا کہ یہ محض بکواس (ہذیان) ہے۔ عبدالصمد اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے رسول اللہ صلعم کا ارشاد نقل کیا گیا۔ (افطر الحاجم والمحجوم) سینگی لگوانے والے اور لگانے والے، دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ابوحنیفہؒ نے کہا محض قافیہ بندی ہے۔ ایسے ہی ان کے سامنے ولاء کے بارے میں حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ نقل کیا گیا تو ابوحنیفہؒ نے کہا کہ یہ کسی شیطان کا قول ہے۔ (عبدالوارث نے بھی ایسا ہی نقل کیا)۔ یحییٰ ابنِ آدم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے یہ حدیث نقل کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے "وضو آدھا ایمان ہے"۔ ابوحنیفہؒ کہنے لگے پھر تو دو وضو کر ڈالو تاکہ تمہارا ایمان مکمّل ہو جائے۔ اسی طرح ابوحنیفہؒ کے سامنے یہ ارشاد نقل کیا گیا کہ...... "لا ادری" (میں نہیں جانتا) کہہ دینا بھی آدھا علم ہے"۔ ابوحنیفہؒ کہنے لگے کہ بس پھر

لہ امام اعظمؒ کے اصل عربی الفاظ یہ ہیں۔ فقال حک هذا بذنب خنزیر (ایضاً ج ۱۳، ص۳۸۷، سطر ۱۲)۔

تو دو مرتبہ لا ادری کہہ دینا چاہیئے تاکہ علم مکمل ہو جائے۔

یہ احکام گذر چکے اور ختم ہو چکے

بشر ابن اسری کہتے ہیں کہ میں ابو عوانہ کے پاس گیا اور میں نے ان سے کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ آپ کے پاس ابو حنیفہؒ کی کوئی کتاب ہے۔ ذرا اسے نکال دیجئے (میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں)۔ ابو عوانہ کہنے لگے۔ بیٹا! تم نے خوب یاد دلایا۔ چنانچہ وہ ایک صندوق کی طرف اُٹھ کر گئے اور ایک کتاب نکال لی اور ریزہ ریزہ کرکے پھینک دیا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ کہنے لگے۔ میں ایک روز ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایلچی آیا۔ اس نے کہا۔ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ ابو حنیفہ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہؒ سے کہا "تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ مجھ سے یحییٰ بن سعید (قطان) نے بیان کیا ہے، انہوں نے محمد بن حبان سے، انہوں نے رافع بن خدیج سے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچیے۔ ورنہ امیر کے ہاں اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابو حنیفہؒ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا، "یہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا۔ چنانچہ اس چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

ان تفاصیل کے بیان کرنے کے بعد، ابو عوانہ نے کہا کہ ایسے آدمی کی کوئی کتاب میرے پاس نہیں رہنی چاہیئے۔ (ایضاً ج ۱۳، صفحہ ۲۹۰-۲۹۱)۔

عقیقہ کرنا جاہلیت کے اعمال میں سے ہے

ابو بکر اثرم کہتے ہیں کہ ابو عبداللہ احمد بن حنبلؒ نے ہمارے سامنے عقیقہ کے بیان میں رسول اللہ صلعم کی بہت سی حدیثیں، صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال بیان کئے۔ پھر بطور تعجّب کے مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔ "مگر ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ یہ جاہلیت کے اعمال میں سے ایک عمل ہے"۔ محمد بن یوسف بیکندی کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا گیا کہ نکاح سے پہلے بھی طلاق دی جا سکتی ہے۔ امام احمد کہنے لگے، مسکین ابو حنیفہ! گویا وہ عراق میں تھے ہی نہیں۔ گویا انہیں علم سے کچھ مَس تھا ہی نہیں۔ اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم، صحابہؓ اور تیس کے قریب کبار تابعین، سعید بن جبیر، سعید بن المسیب، عطار، طاؤس اور عکرمہ وغیرہ کے ارشادات اور اقوال موجود ہیں کہ نکاح سے پہلے طلاق

نہیں پڑ سکتی۔ ابوحنیفہ ایسے کہنے کی جرأت کیونکر کر سکتے ہیں کہ طلاق پڑ جاتی ہے۔

(تاریخِ بغداد مصنف ابوبکر خطیب، جلد ۱۳، صفحہ ۴۱۱)

آپ نے دیکھا کہ حدیث کے متعلق فقہ اسلامی کے سب سے بڑے امام کا مسلک کیا ہے۔ ان کی مدوّن فرمودہ یا ان کی طرف منسوب کردہ فقہ مسلمانوں کی اکثریت میں رائج ہے لیکن ہمارے ہاں نہ تو امام اعظمؒ کو منکرِ حدیث کہا جاتا ہے اور نہ ہی حنفی مسلمانوں کو، حالانکہ جس تشدّد سے انکارِ حدیث امام ابوحنیفہؒ کے ہاں پایا جاتا ہے کسی "منکرِ حدیث" کے ہاں کم ہی بایسا پایا جاتا ہوگا۔

اگر میں رسولُ اللہ کے عہد میں ہوتا تو آپؐ بھی میرے بہت سے اقوال کو اختیار فرما لیتے

امام اعظمؒ نے اپنے اس مسلک کی تائید میں دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلعم کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ تعینِ جزئیات (تدوینِ فقہ) میں صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور جس کی رائے بہتر ہوتی تھی، اسے اختیار فرما لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ کہتے کہ اگر میں بھی رسولُ اللہ کے زمانہ میں ہوتا تو میں بھی اس مجلسِ مشاورت میں شریک ہوتا، اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضورؐ میری رائے کو اختیار فرما لیتے۔ چنانچہ

> محمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سُنا کہ امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ صلعم مجھے پاتے اور میں ان کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے اور ابواسحاق کو میں نے کہتے سنا ہے کہ ابوحنیفہ کے سامنے اکثر نبی صلعم کی حدیثیں آتیں اور وہ ان کی مخالفت کیا کرتے۔ (ایضاً، جلد ۳، صفحہ ۳۸۷)

یوسف بن اسباط سے ابوصالح الفرا نے بھی اسی قول کو نقل کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

> ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلعم مجھے پاتے اور میں آپؐ کو پاتا (یعنی دونوں ایک زمانہ میں ہوتے) تو آپ میرے بہت سے اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا اور کیا ہے وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (ایضاً، جلد ۱۳، صفحہ ۳۹۰)

ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ مرکزِ ملت

(یعنی قرآنی مملکت کی صاحبِ اختیار اتھارٹی) نمائندگانِ امت کے مشورہ سے قرآنی اصولوں کی روشنی میں جو فیصلے کرے وہ شریعتِ اسلامی کہلاتے ہیں اور یہ فیصلے زمانے کے حالات کے ساتھ ساتھ قابلِ تغیر و تبدل ہوتے ہیں۔

حدیث کے متعلق امام صاحب کا یہی وہ مسلک تھا جس کی بنا پر آپ کو بعد میں منکرِ حدیث قرار دیا گیا اور ان کے خلاف طرح طرح کی طعن آمیز باتیں کی گئیں اور عجیب عجیب الزامات اور فتاویٰ سے انہیں نوازا گیا. مثلاً

امام ابوحنیفہؒ پر محدثین کا طعن و تشنیع

امام مالک بن انسؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کا فتنہ اس امت کے لئے ابلیس کے فتنہ سے کم نہیں. دونوں باتوں میں یعنی عقیدہ ارجاء میں بھی اور احادیث کو رد کرنے میں بھی. عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ میں دجال کے فتنہ کے بعد اسلام میں کسی فتنہ کو ابوحنیفہؒ کے فتنہ سے بڑا نہیں دیکھتا........ (ایضاً، ج ۱۳، ص ۳۹۶). سلیمان بن حسان حلبی کہتے ہیں کہ میں نے بے شمار مرتبہ امام اوزاعیؒ کو کہتے سنا ہے ابوحنیفہؒ نے اسلام کے ایک ایک دستہ کو گن گن کر توڑا ہے. ایسے ہی جب امام ابوحنیفہؒ کا انتقال ہوا تو امام

امام ابوحنیفہؒ اسلام کے ایک ایک دستہ کو گن گن کر توڑ رہے تھے

اوزاعیؒ نے کہا. خدا کا شکر ہے. وہ اسلام کے ایک ایک دستہ کو توڑ رہا تھا. فزاری کہتے ہیں کہ میں نے سفیانؒ اور اوزاعیؒ دونوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اسلام میں ابوحنیفہؒ سے زیادہ بدبخت ترین پیدا نہیں ہوا. امام شافعیؒ نے بدترین کا لفظ کہا ہے. قیس بن الربیعؒ سے ابوحنیفہؒ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ماضی (روایات و آثار) کا جاہل ترین اور مستقبل (استنباط و احکام) کا عالم ترین شخص ہے. (ایضاً ج ۱۳، ص ۴۹۸).

امام ابوحنیفہؒ کی مخالفت ہی حق ہے

عمرو بن قیس کا قول ہے کہ جو شخص حق کو معلوم کرنا چاہے اسے کوفہ کے ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے قول کو دیکھنا چاہیئے اس کے بعد ان اقوال کے خلاف کرنا چاہیئے. عمار بن زریق کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ

کی مخالفت کرو تم حق کو پالو گے۔ بشر ی کہتے ہیں کہ تم ابو حنیفہ کی مخالفت کرو گے تو حق کو پالو گے۔ ابنِ عمار کہتے ہیں کہ جب تمہیں کسی بات میں شک ہو تو دیکھ لو کہ ابو حنیفہ نے کیا کہا ہے۔ بس اس کی مخالفت کرو کہ حق وہی ہو گا۔ یا یوں کہو کہ اس کی مخالفت ہی میں برکت ہے۔ (ایضاً ج ۱۳، ص ۴۰۸)

مسجد میں امام ابو حنیفہ کا نام لینا جرم تھا

ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ میں اسود ابنِ سالم کے ساتھ رصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آ گیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ابو حنیفہؒ ایسا کہتے ہیں تو اسود نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ تو مسجد میں ابو حنیفہؒ کا تذکرہ کرتا ہے؟ اور مسجد میں ابو حنیفہؒ کا نام لے دینے کے جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک مجھ سے کلام نہیں کیا۔ (ایضاً ج ۱۳، ص ۴۰۹)

سفیانؒ نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے والد سے یہ حدیث نقل کی کہ بنی اسرائیل کا معاملہ اعتدال پر قائم تھا حتیٰ کہ ان میں لونڈی بچوں کا غلبہ ہو گیا جنہوں نے دین میں رائے کو دخل دیا۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کر دیا۔ اس کے بعد سفیانؒ نے کہا کہ اسلام میں بھی لوگوں کا معاملہ اعتدال پر قائم تھا۔ حتیٰ کہ اسے ابو حنیفہؒ نے کوفہ میں، بتی نے بصرہ میں اور ربیعہ ابن عبدالرحمٰن نے مدینہ میں بدل ڈالا۔ ہم نے غور کیا تو ان سب کو ہم نے لونڈی بچے ہی پایا۔ (ایضاً ج ۱۳، ص ۳۹۴)

فقہ حنفی دجالوں کا کلام ہے

حمدویہ بن مخلد کہتے ہیں کہ محمد بن مسلمہ مدینی سے پوچھا گیا کہ "کیا وجہ ہے کہ ابو حنیفہؒ کی رائے سارے شہروں میں گھس گئی ہے مگر مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہو سکی؟" محمد بن مسلمہ نے جواب دیا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ مدینہ منورہ کی ہر گلی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو مدینہ میں دجال کو داخل ہونے سے روکے گا۔ اور یہ بھی چونکہ دجالوں ہی کا کلام ہے اس لئے وہاں داخل نہیں ہو سکا۔ (ایضاً ج ۱۳، ص ۳۹۶)

امام ابو حنیفہ حدیث میں یتیم اور گونگے تھے

ابنِ اسحاق ترمذی کہتے ہیں کہ عبداللہ بن المبارک نے کہا ابو حنیفہؒ حدیث میں بالکل یتیم تھے۔ سریج بن یونس نے ابو قطن سے نقل کیا ہے کہ اگرچہ ابو حنیفہؒ سے ہم نے حدیث بیان کی ہے مگر وہ حدیث میں گونگے تھے۔ ابنِ نمر کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو اس پر متفق پایا ہے کہ وہ رائے تو رائے، ابو حنیفہؒ کی حدیث پر بھی اعتماد نہیں کرتے تھے۔ حجاج بن ارطاۃ کہتے ہیں کہ "ابو حنیفہ کون تھا؟ ابو حنیفہؒ کی بات کون قبول کرتا

ہے ؟ ابوحنیفہؒ تھا ہی کیا ؟" علی بن المدینی" کہتے ہیں کہ یحییٰ ابنِ سعید قطان کے سامنے ابوحنیفہ کا ذکر آگیا اور ان سے ابوحنیفہؒ کی حدیث کے متعلق سوال کیا گیا۔ تو یحییٰ نے کہا کہ " وہ حدیث والے تھے ہی کب؟" محمد بن حماد مقری کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین سے ابوحنیفہؒ کے متعلق سوال کیا تو یحییٰ نے کہا" ان کے پاس حدیثیں تھیں ہی کتنی جو تم ان کے متعلق پوچھتے ہو؟" ابوبکر ابن شاذان کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوبکر ابن ابی داؤد نے کہا کہ ابوحنیفہؒ نے کل ایک سو پچاس حدیثیں نقل کی ہیں اس میں سے بھی آدھی حدیثوں میں غلطی ہے۔

امام ابوحنیفہ نہ ثقہ تھے نہ مامون

موئل کہتے ہیں کہ سفیان ثوری کے سامنے ابوحنیفہ کا ذکر آیا۔ سفیان ثوری اس وقت حطیم کعبہ میں تھے (یعنی طواف کر رہے تھے) (سفیان) نے کہا کہ ابوحنیفہؒ نہ ثقہ تھے، نہ مامون تھے اور وہ اپنے ان الفاظ کو برابر دہراتے رہے۔ تا آنکہ ان کا طواف ختم ہوگیا۔ (ایضاً ج ۱۳، ص۴۱۵)

مندرجہ بالا آراء کو سامنے رکھئے اور غور کیجئے کہ یہ کن لوگوں کی رائیں ہیں اور کس کے متعلق ہیں، ان میں کا ہر شخص علمِ حدیث اور علمِ رجال کا ستون تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان اساتینِ سنّت کا یہ فیصلہ تو خود امام ابوحنیفہؒ کے متعلق تھا۔ اب دیکھئے کہ امام ابوحنیفہؒ کے دونوں اولوالعزم شاگردانِ رشید، یعنی امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے متعلق یہ حضرات کیا رائے رکھتے ہیں۔ مگر آگے بڑھنے سے پہلے اتنی بات ذہن نشین کر لیجئے کہ فقہ حنفی میں خود امام ابوحنیفہؒ کی کوئی کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ ہم تک جو کچھ پہنچا ہے وہ ان دو حضرات (صاحبین) کی وساطت سے پہنچا ہے۔

امام ابویوسفؒ کے متعلق ائمہ رجال کی رائے

عبدالرزاق بن عمر کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن المبارک کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے آکر عبداللہ بن المبارک سے کوئی مسئلہ پوچھا۔ عبداللہ نے اس کو فتویٰ دیا۔ وہ شخص کہنے لگا کہ میں نے یہی مسئلہ ابویوسفؒ سے بھی پوچھا تھا۔ مگر انہوں نے آپ کے خلاف فتوے دیا ہے۔ عبداللہ ابن المبارک نے کہا۔" اگر تو نے ابویوسفؒ کے پیچھے کچھ نمازیں پڑھی ہوں جو تجھے یاد ہوں تو جا کر فوراً ان نمازوں کو دہرا لو۔ (ایضاً، ج ۱۴، ص۲۵۷)۔

ابویوسف جھوٹے اور فاسق تھے

عبدہ بن عبداللہ خراسانی کہتے ہیں کہ کسی نے عبداللہ ابن المبارک سے پوچھا کہ ابویوسف اور محمد میں زیادہ

سچا کون ہے؟ عبداللہ ابن المبارک نے کہا یوں نہ کہو۔ بلکہ یوں پوچھو کہ زیادہ جھوٹا کون ہے؟ اس آدمی نے کہا۔ اچھا یوں ہی بتایئے۔ عبداللہ نے کہا۔ ابویوسفؒ۔ (ایضاً)

عبداللہ بن ادریس کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ ایک گمراہ اور گمراہ کن شخصیت تھے اور ابویوسفؒ فاسقوں میں سے ایک فاسق تھے۔ (ایضاً)

امام ابویوسفؒ نے امام ابوحنیفہؒ پر جھوٹ باندھے

محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ (صاحب الصحیح) فرماتے ہیں کہ ہم سے نعمان (امام ابوحنیفہؒ) کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ تم لوگوں کو یعقوب (امام ابویوسفؒ) پر تعجب کیوں نہیں آتا۔ اس نے مجھ پر اس قدر جھوٹ باندھ دیئے ہیں جو میں نے کبھی نہیں کہے۔ (ایضاً ج ۱۲، ص ۲۵۸)

ابونعیم فضل بن دکین کہتے ہیں کہ میں نے خود ابوحنیفہؒ کو ابویوسفؒ سے یہ کہتے سُنا ہے "تمہارا ستیاناس ہو، ان کتابوں میں تم مجھ پر کتنا جھوٹ باندھ رہے ہو جو میں نے کبھی نہیں کہا۔ (ایضاً)

ابنِ ابی شیبہ اور ابن المغلانی یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں کہ ابویوسفؒ قاضی کو حدیث کی کوئی پہچان نہیں تھی۔ تاہم وہ ثقہ ہیں۔ (ایضاً ج ۱۲، ص ۲۵۹)

احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ اگرچہ میں نے سب سے پہلے ابویوسفؒ ہی سے حدیثیں لکھی ہیں۔ مگر میں ان کی حدیثیں بیان نہیں کرتا۔ نیز فرمایا کہ اگرچہ ابویوسفؒ سچے ہیں مگر ابوحنیفہؒ کے اصحاب میں سے کسی سے بھی احادیث بیان نہیں کرنی چاہئیں۔

ابوالحسن (امام) دارقطنی سے ابویوسفؒ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ محمدؒ بن الحسن کی نسبت زیادہ قوی ہیں مگر اندھوں میں کانے ہیں۔ امام محمد بن اسمٰعیل بخاری کہتے ہیں کہ یعقوب بن ابراہیم ابویوسفؒ قاضی کو محدثین نے ترک کر دیا۔ (ایضاً، ج ۱۴، ص ۲۶۰-۲۵۹)

امام محمدؒ بن الحسنؒ کے متعلق ائمہ رجال کی رائے

امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ یعقوب ابویوسف تو حدیث کے ساتھ موصوف تھے مگر ابوحنیفہ اور محمد بن الحسن دونوں احادیثِ نبویؐ کے مخالف تھے۔ ان دونوں کی رائے بڑی ہی خراب تھی۔ یعنی ابوحنیفہؒ اور محمد بن الحسن کی۔ (ایضاً، ج ۲، ص ۱۷۹)

یحییٰ بن معین سے محمد بن الحسنؒ کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ "محمد بن الحسنؒ کذاب ہے۔" ایسے

امام محمدؒ کذاب تھے

ہی ایک مرتبہ یوں کہا کہ "ضعیف ہے" کبھی فرمایا وہ تو کچھ بھی نہیں ہے اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔ (ایضاً ج ۲، ص ۱۸۰)

امام ابوداؤد سجستانیؒ کہتے ہیں کہ محمد بن الحسنؒ شیبانی کچھ بھی نہیں ہے اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔
(ایضاً ج ۲، ص ۱۸۱)

امام ابوالحسنؒ دارقطنی کہتے ہیں کہ محمد ابن الحسنؒ شیبانی صاحبِ ابوحنیفہؒ کو یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبلؒ نے کذاب کہا ہے۔ مگر میرے نزدیک وہ بالکل ہی چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ (ایضاً ج ۲، ص ۱۸۱)

امام محمدؒ نے امام ابویوسفؒ پر جھوٹ باندھے

بشر بن الولید کہتے ہیں کہ ابویوسفؒ نے کہا "ذرا اس کذاب یعنی محمد بن الحسن سے پوچھو کہ جو کچھ وہ مجھ سے نقل کرتا ہے وہ کبھی اس نے مجھ سے سنا بھی ہے؟" (ایضاً ج ۲، ص ۱۸۰)

یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ میرے سامنے محمد بن الحسنؒ سے پوچھا گیا کہ کیا ان کتابوں کو جنہیں تم نقل کرتے ہو تم نے ابویوسفؒ سے سنا ہے؟ تو محمدؒ نے جواب دیا کہ نہیں خدا کی قسم میں نے ان کو ابویوسفؒ سے نہیں سنا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ میں ان کتابوں کو سب لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں اور میں نے تو ابویوسف سے صرف جامع صغیر سنی ہے۔ (ایضاً)

فقہ حنفی ابدالآباد تک کے لئے ناقابلِ تغیر نہیں تھی

حدیث کے متعلق آپ نے امام اعظمؒ (اور ان کے شاگردانِ رشید کا) مسلک دیکھ لیا۔ اب اس ضمن میں ایک بات اور سامنے آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ کیا امامِ اعظمؒ کا یہ منشا تھا کہ وہ اپنی فقہ کو قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دیں؟ ظاہر ہے کہ جس شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے بھی قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار نہیں دیئے جا سکتے وہ کبھی خود اپنے فیصلوں کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ انہیں قیامت تک کے لئے غیر متبدل سمجھا جائے؟ اس باب میں بھی تاریخی شہادات موجود ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس بات کو بھی شدت سے روکا کہ ان کے اجتہادات کو ابدی حیثیت دی جائے۔ چنانچہ:-

فقہ حنفی کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کی تصریحات

نضر بن محمدؒ کہتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا کرتے تھے اور ہمارے

ساتھ

ایک شام کا آدمی بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی (فراغت کے بعد) واپس جانے لگا تو امام ابوحنیفہؒ سے رُخصت ہونے کے لئے آیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس سے پوچھا" اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ شام کی طرف لے جاؤ گے۔" شامی نے جواب دیا "ہاں"۔ اس پر امام نے فرمایا "خیال رکھنا۔ تم بہت بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو" (خطیب ج ۳، ص۴۱۰)۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا۔ بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ ابوحنیفہؒ فیصلے فرماتے ہم ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔ امام زفرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابوحنیفہؒ نے ابویوسف سے فرمایا۔ یعقوب! تیرا ناس ہو۔ جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابونعیمؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابویوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطاکار ہوں یا مصیب۔ (ایضاً)۔ سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابوحنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا۔ فبشر عبادِ الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ (۳۹/۱۸) (یعنی اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو بشارت دے دو جو باتوں کو سنتے ہیں اور پھر ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں (ایضاً ج ۱۴، ص۳۵۲)۔ حسن بن زیاد لولوی کہتے ہیں کہ "ہمارا یہ قول (فقہ) ایک رائے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کر سکے ہیں۔ جو ہمارے قول سے بہتر لا سکے تو وہی صحت سے زیادہ قریب ہوگی۔" (ایضاً)

ظاہر ہے کہ امام موصوف کی ان تصریحات کے بعد کہ وہ بھی اپنی فقہ کو شک وشبہ سے بالا اور غلطی وخطا سے مبرا نہیں سمجھتے تھے، ہمارے لئے کہاں تک یہ مناسب ہوسکتا ہے کہ ہم ان کی آراء کو وحیٔ الٰہی کا مقام دے دیں اور خطا وغلطی سے بری قرار دے کر قیامت تک کے لئے امت کا دستور العمل بنا دیں۔

تصریحاتِ بالا کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے۔ آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ تھا:

(۱) دین میں غیر متبدّل صرف قرآن کے احکام اور اصول ہیں۔ اور یہی کتاب ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔

(۱۱) روایات تاریخی حیثیت کی حامل ہیں جن سے اجتہاد میں مدد تو لی جا سکتی ہے مگر مستقل دین کی حیثیت سے ان کو ناقابلِ تبدیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(۱۱۱) قرآن کے اصول کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے فقہ مرتّب کرنی چاہیئے لیکن یہ اجتہادات بھی قیامت تک کے لئے غیر متبدّل قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

اس کے بعد آپ یہ دیکھئے کہ امام صاحب کے اس مسلک کے متعلق کیا کہا جاتا تھا' اس سلسلہ میں ہم صرف امام احمد بن حنبلؒ کے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں۔

> ابراہیم حوبی کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ نے علم میں ایسی بہت سی چیزیں داخل کر دی ہیں جن سے خالی پانی کو چبانا زیادہ اچھا ہے۔ میں نے ایک روز ابو حنیفہؒ سے کچھ مسائل امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے پیش کئے تو وہ تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابو حنیفہؒ تو بالکل ہی ایک نیا اسلام تصنیف کر رہے ہیں"۔ (ایضاً ' ج ۱۳' ص ۴۱۳)

لہٰذا اگر کوئی شخص آج حدیث کے متعلق وہی بات کہے جو امام اعظمؒ فرماتے تھے اور ایسے شخص کے متعلق ہمارا قدامت پرست طبقہ کہے کہ یہ ایک نیا دین پیدا کیا جا رہا ہے تو یہ بات بھی کوئی نئی نہیں۔ ایسا شروع سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔

قرآنِ کریم
(روایات کے آئینہ میں)

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

دین کا مدار تمام تر یقین پر ہے۔ یہی وہ اصل و بنیاد ہے جس پر اس کی پوری کی پوری عمارت اٹھتی ہے۔ یقین اس امر کا کہ جس بات کو ہم دینی کہتے ہیں وہ بلا شک و شبہ خدا کی طرف سے ہے۔ اگر اس بنیاد میں ذرا سا بھی تزلزل پیدا ہو جائے تو دین کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔ اس میں تھوڑے اور بہت کا سوال ہی نہیں۔ مثلاً ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر اپنی وحی نازل کی اور اصل و بنیاد کے اعتبار سے انہیں بھی وہی "دین" عطا کیا جو قرآن مجید میں ہے۔ آج یہود اور نصاریٰ دونوں اس کے مدعی ہیں کہ ان کے پاس تورات اور انجیل موجود ہے لیکن اس کے باوجود ہم ان کتابوں کو دین نہیں مانتے۔ اس کی وجہ ظاہر اور وہ یہ کہ ان کتابوں میں تغیّر و تبدّل ہو چکا ہے۔ اور ہم آج یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ ان میں موجود ہے وہ وہی ہے جو ان انبیاء کی طرف نازل ہوا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کچھ باتیں تو ایسی ہوں گی جن میں ردوبدل نہیں ہوا۔ ان باتوں کو تو دین ماننا چاہیئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان میں کچھ باتیں ایسی ضرور ہوں گی، لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، دین کے جس معاملہ میں ذرا سا بھی شک و شبہ پیدا ہو وہ دینی نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے تورات و انجیل دینی کتابیں تسلیم نہیں کی جا سکتیں۔ اس کے بعد قرآن کریم کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ یہ لفظاً لفظاً، حرفاً حرفاً "الحمد" سے "والناس" تک بعینہٖ وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کیا اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دیا۔ اب سوچیئے کہ اگر کسی کے دل میں اس چیز کے متعلق ذرا

سا بھی شبہ پیدا ہو جائے تو اس کے نزدیک قرآن دین کا ضابطہ نہیں بن سکتا۔ اس کی حیثیت بھی وہی ہو جائے گی جو انجیل اور تورات کی ہے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ خدا کے دیئے ہوئے دین کی جگہ ایک نیا "مذہب" بنا دینے کے لئے سب سے مؤثر حربہ اور کامیاب طریقہ یہ تھا کہ غلط حدیثیں وضع کی جائیں اور انہیں رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ کچھ کیا گیا اور بڑی جرأت اور دھڑلے سے کیا گیا۔ لیکن احادیث پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا تھا کہ اگر یہ بھی دین تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کی طرح ان کا بھی کوئی مستند مجموعہ لکھوا کر امت کو کیوں نہ دیا۔ اور قرآنِ کریم ہی کی طرح ان کو بھی یاد کرا کر محفوظ کیوں نہ کر دیا۔ اگر قرآن متن تھا' اور حدیث اس کی شرح تھی۔ اگر قرآن اجمال تھا اور حدیث اس کی تفصیل تھی۔ اگر قرآن ایک ایسی کتاب تھی جو احادیث سے منسوخ بھی ہو سکتی تھی اور اس طرح حدیث ہی فیصلہ کن چیز تھی تو قرآن سے زیادہ احادیث کو محفوظ اور مستند صورت میں امت کے حوالہ کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ اتنا بڑا اعتراض تھا جس سے گلو خلاصی آسان نہ تھی۔ انہوں نے اس مشکل کا حل یہ سوچا کہ خود قرآن کے متعلق ہی یہ خیال پھیلا دیا جائے کہ رسول اللہؐ نے اسے بھی محفوظ شکل میں امت کو نہیں دیا تھا۔ اسے بھی بعد میں آنے والوں نے مرتب اور مدوّن کیا تھا' اور جس طرح احادیث کے بیانات میں آپ کو اختلافات نظر آتے ہیں' اسی طرح (معاذ اللہ) قرآنِ کریم میں بھی صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمانے میں کافی اختلافات موجود تھے جس طرح روائتیں خبرِ واحد ہیں کہ کسی ایک صحابی نے بیان کی ہیں' اسی طرح قرآن کی آیتیں بھی ایک ایک دو دو آدمیوں کے بیان پر جمع کر لی گئی تھیں وغیرہ ذالک من الخرافات۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے احادیث وضع کیں اور ان کی عام تشہیر کر دی۔ یہ روایات احادیث کے مجموعوں میں آج بھی موجود ہیں۔ اس ضمن میں حافظ ابوبکر عبداللہ ابن ابی داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی کی شہرۂ آفاق کتاب "کتاب المصاحف" ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس میں قرآنِ کریم سے متعلق ان تمام روایات کو یکجا جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ روایتیں اکثر صحاح ستہ اور دوسری مستند کتب روایات میں منتشر طور پر موجود ہیں یہ کتاب ابوبکر عبداللہ بن ابی داؤد کی تصنیف ہے۔ جن کا سن پیدائش ۲۳۰ھ اور سن وفات ۳۱۶ھ ہے۔ آپ حدیث کے مشہور امام ابوداؤد سلیمان ابن اشعث سجستانی (جن کی کتاب سنن ابوداؤد صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے) کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کی کتاب المصاحف علمائے حدیث کے ہاں مستند کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اکثر متقدمین کی کتابوں میں اس کتاب کے حوالے ملتے ہیں۔ امام ابن الجزریؒ نے

کتابُ المصاحف

ان کو ثِقَۃٌ کبیرۃٌ مامونٌ کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

یہ بغداد میں امام العراق کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، عوام اور حکومت میں ان کا بڑا احترام تھا اور مسجدِ بغداد میں سلطانِ وقت نے ان کے لئے ایک منبر نصب کرادیا تھا جس پر بیٹھ کر یہ حدیثیں بیان فرماتے تھے۔ عراق کے عامہ مشائخ نے ان سے حدیثیں لکھیں اور ان سے تحصیلِ علم کیا۔ لیکن کوئی ان کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکا۔

مصنف کے اس مختصر تعارف کے بعد ہم آپ کو کتاب المصاحف کے جستہ جستہ مقامات سے روشناس کراتے ہیں۔ سنتے جایئے اور سر دھنتے جایئے۔

قرآن کو حضورؐ نے جمع نہیں کیا بلکہ حضرت صدّیق اکبرؓ نے جمع کرایا

(۱) امام ابنِ ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ زید بن ثابت سے نقل کرتے ہیں کہ جس سال اہلِ یمامہ کا قتل ہوا، ابوبکرؓ نے مجھے آدمی بھیج کر بلایا۔ وہاں عمرؓ بھی موجود تھے۔ ابوبکرؓ کہنے لگے کہ یہ (عمرؓ) میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قرآن کے قاریوں کے ساتھ قتل کی گرم بازاری ہوگئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ دوسرے مواقع پر بھی یہی گرم بازاری ہو اور اس طرح قرآن ضائع ہوجائے۔ میری رائے ہے کہ قرآن کو جمع کرلو۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسول اللہ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کرتے ہو۔ عمرؓ نے کہا بخدا یہ کام اچھا ہی ہے اور اس بارے میں مجھ سے برابر کہتے رہے حتّٰی کہ جس چیز کے لئے خدا نے ان کا شرح صدر کردیا تھا، میرا بھی شرح صدر کردیا اور میری رائے بھی وہی ہوگئی جو اِن کی تھی۔ ابوبکرؓ مجھ سے کہنے لگے تم نوجوان اور عقل مند آدمی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وحی لکھتے رہے ہو۔ ہم تمہیں متہم نہیں سمجھتے۔ لہٰذا تم قرآن کو لکھ لو۔ زید بن ثابت کہتے ہیں کہ بخدا اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جانے کو کہتے تو وہ مجھ پر اس کام سے زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ کام تم کیسے کرتے ہو۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ کہنے لگے کہ بخدا یہ کام اچھا ہی ہے۔ چنانچہ ابوبکرؓ اور عمرؓ برابر مجھ سے کہتے رہے حتّٰی کہ جس امر کے لئے دونوں کا شرح صدر ہوچکا تھا، میرا بھی شرح صدر ہوگیا اور وہی میری رائے بھی ہوگئی جو ان دونوں کی رائے تھی۔ چنانچہ لکھنے کے لئے میں نے کاغذ کے ٹکڑوں، کھجور کے پٹھوں، پتھروں کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں (حافظوں) سے تلاش کرنا شروع کیا۔ حتّٰی کہ ایک آیت جو میں حضورؐ کو پڑھتے ہوئے سُنتا

کرتا تھا، مجھے نہیں ملی۔ یعنی لقد جاءکم رسول من انفسکم (الآیہ)۔ چنانچہ میں نے اس کو ڈھونڈا۔ بالآخر خزیمہ بن ثابت کے پاس ملی اور میں نے اس کو اس کی سورۃ میں لکھ دیا۔

صدیق اکبرؓ کے زمانے میں قرآن کیونکر جمع کیا گیا

(۲) امام ابنِ ابی داوٗد اپنی سند کے ساتھ عروہ ابن زبیر سے نقل کرتے ہیں کہ جب بہت سے قاری قتل ہوگئے تو ابو بکرؓ کو یہ خوف ہوا کہ اس طرح تو قرآن ہی ضائع ہو جائے گا۔ آخر انہوں نے عمرؓ اور زید ابنِ ثابت سے کہا کہ مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو شخص کتاب اللہ کے متعلق کسی چیز پر دو گواہ پیش کردے، اس کو قرآن میں لکھ لو۔

(۳) امام ابنِ ابی داوٗد اپنی سند کے ساتھ عبد خیر سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو کہتے ہوئے سُنا کہ مصاحف کے بارے میں سب سے بڑا ثواب ابو بکرؓ کو ملے گا۔ خدا ابو بکرؓ پر رحم فرمائے، وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن کو لوحین کے درمیان جمع کر دیا۔

قرآن صدیق اکبرؓ نے خود جمع کیا اور حضرت زیدؓ نے نظرِ ثانی فرمائی

(۴) امام ابنِ ابی داوٗد اپنی سند کے ساتھ سالم اور خارجہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابو بکر صدیقؓ نے قرآن کو کاغذات میں جمع تو کر لیا تھا۔ مگر زید بن ثابتؓ نے اس سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے عمرؓ سے مدد چاہی کہ وہ زید بن ثابت کو راضی کرادیں۔ چنانچہ عمرؓ نے انہیں راضی کرادیا اور نظرِ ثانی کردی۔ یہ کتابیں ابو بکرؓ کی وفات تک ان کے پاس رہیں۔ پھر عمرؓ کی وفات تک ان کے پاس رہیں۔ پھر حفصہؓ اہلیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہیں۔ عثمانؓ نے انہیں منگایا، تو حفصہؓ نے ان کو دینے سے انکار کردیا۔ حتیٰ کہ عثمانؓ سے عہد لیا کہ وہ انہیں واپس کردیں گے اور اس شرط کے ساتھ بھیج دیں۔ چنانچہ عثمانؓ نے ان کو مصحفوں میں لکھ کر حفصہؓ کو وہ کتابیں واپس کردیں اور وہ ان ہی کے پاس رہیں حتیٰ کہ مروان نے اپنے زمانے میں انہیں لے کر جلا دیا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایسے اہم واقعہ کے متعلق ایک بیان دوسرے سے کس طرح ٹکراتا جارہا ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہاں تک یہ کہا گیا ہے کہ قرآن رسول اللہؐ نے مرتب کر کے نہیں دیا تھا۔ بلکہ حضرت ابو بکرؓ صدیق کے عہد میں مرتب ہوا تھا۔ اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔

جمع قرآن کا کام صدیق اکبرؓ نے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے شروع کیا اور عثمانؓ نے تکمیل کی

(۵) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب سے نقل کرتے ہیں کہ عمرؓ ابن الخطاب نے قرآن کو جمع کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لئے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا جس شخص نے رسول اللہ سے کچھ بھی قرآن حاصل کیا ہو اسے ہمارے پاس لے آئے۔ لوگوں نے قرآن کو کاغذات پر، لکڑی کی تختیوں پر اور کھجور کے پٹھوں پر لکھا تھا اور عمرؓ کسی شخص سے کوئی چیز اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک دو گواہ گواہی نہ دیں۔ اسی اثنا میں عمرؓ شہید ہو گئے تو عثمانؓ ابن عفان کھڑے ہوئے اور انہوں نے لوگوں سے کہا کہ جس کے پاس کتاب اللہ کا کچھ حصہ ہو، وہ ہمارے پاس لے آئے۔ اور یہ بھی اس وقت تک کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے جب تک دو گواہ گواہی نہ دے دیں۔ چنانچہ خزیمہ ابن ثابت آئے اور کہنے لگے کہ میں دیکھ رہا ہوں تم نے دو آیتیں لکھنے سے چھوڑ دی ہیں۔ پوچھا گیا۔ وہ کون سی دو آیتیں ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے خود رسول اللہ صلعم سے یہ دو آیتیں حاصل کی تھیں۔ "لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم" آخر سورت تک۔ اس پر عثمانؓ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ دونوں آیتیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ پھر عثمانؓ نے خزیمہ سے پوچھا۔ "بتاؤ ان آیتوں کو کہاں رکھیں"۔ خزیمہ نے جواب دیا کہ قرآن کی جو سورت سب سے آخر میں نازل ہوئی ہو۔ اسے ان آیتوں ہی سے ختم کردو۔ چنانچہ سورۃ برأۃ کو ان ہی دو آیتوں سے ختم کر دیا گیا۔

یہ دو آیتیں تو مل گئیں لیکن دو آیتیں اس طرح ضائع ہو گئیں کہ وہ قیامت تک نہیں مل سکتیں۔

بکری کھا گئی

سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک مستند کتاب ہے) حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب حسب ذیل روایت ملتی ہے۔ آپ نے کہا۔

> آیۂ رجم (یعنی زانی کو سنگسار کرنے) اور آیۂ رضاعتِ کبیر ایک صحیفہ میں تھی جو میرے تخت کے نیچے رکھا تھا۔ جب رسولؐ اللہ کی وفات ہوئی تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول تھے۔ اتنے میں گھر کی پالتو بکری آ گئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی (اور وہ آیتیں ضائع ہو گئیں)۔

چنانچہ اس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ان آیتوں کو قرآن مجید میں تو شامل نہ کیا جائے لیکن عمل ان کے مطابق ہو۔ یہ جو ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ شادی شدہ زانی کی سزا سنگسار ہے تو اس کا مدار اسی گمشدہ آیت پر ہے۔ موجودہ

قرآنِ مجید میں زانی کی سزا سو دُرّے ہے۔

بہرحال، جمعِ قرآن کی داستان (از روئے روایات) یہاں تک پہنچ گئی کہ اسے نہ تو رسول اللہ نے مرتب فرمایا۔ نہ ہی یہ عہدِ صدیقی میں مرتب ہوا۔ اس کی ابتدا حضرت عمرؓ نے کی اور وہ بھی اسے ادھورا چھوڑ کر شہید ہوگئے۔ اب آگے بڑھئے۔

عہدِ عثمانی میں اختلاف

(۶) امام ابنِ ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ یزید بن معاویہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں ولید بن عقبہ کے زمانہ میں مسجد میں اس حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا جس میں حضرت حذیفہؓ (مشہور صحابی) بھی تشریف فرما تھے۔ مسجد میں اس وقت روکنے والے اور پولیس کے سپاہی وغیرہ موجود نہیں تھے کہ یکایک کسی پکارنے والے نے پکار کر اعلان کیا جو شخص ابو موسیٰ (اشعری) کی قرأت پر قرآن پڑھتا ہو وہ اس گوشہ کی طرف آجائے جو ابواب کندہ کے پاس ہے اور جو شخص عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت پر قرآن پڑھتا ہو وہ اس گوشے کی طرف آجائے جو عبداللہ کے گھر کی طرف ہے اور وہاں دو آدمیوں میں سورۂ بقرہ کی ایک آیت کے بارے میں اختلاف ہوا تھا۔ ایک پڑھتا تھا۔" واتموا الحج وَ العمرة للبیت" اور دوسرا پڑھتا تھا کہ" واتموا الحج و العمرة الله"۔ حضرت حذیفہؓ کو غصہ آگیا۔ ان کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ انہوں نے فوراً اپنے کرتہ کو سمیٹ کر بغل میں کیا اور مسجد ہی میں کھڑے ہوگئے۔ یہ واقعہ حضرت عثمانؓ کے زمانے کا ہے اور فرمانے لگے۔ یا تو امیر المومنینؓ میرے پاس آئیں اور یا میں ان کے پاس جاؤں (تو میں اس کے متعلق ان سے کہوں) کیونکہ تم سے پہلی امتوں نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ انہوں نے مومنین کو ساتھ لے کر منکرین سے قتال کیا۔ حتیٰ کہ خدا نے اپنے دین کو غالب کردیا۔ پھر خدا نے محمد صلعم کو اٹھا لیا۔ تو لوگوں نے بے لگام گھوڑے کی طرح ہر طرف دوڑ لگانی شروع کردی۔ پھر خدا نے عمرؓ کو خلیفہ بنایا تو وہ اسلام کے عین وسط میں اُترے (اور اس کو اعتدال پر قائم کرنا چاہا)۔ پھر خدا نے ان کو بھی اٹھا لیا تو لوگوں نے پھر مُنہ زور گھوڑے کی طرح ہر طرف جادہ پیمائی شروع کردی۔ اس کے بعد خدا نے عثمانؓ کو خلیفہ بنایا اور اللہ کی قسم وہ وقت قریب ہے لوگ اسلام میں وہ جادہ پیمائی کریں جو اپنی تمام پچھلی جادہ پیمائیوں کو پیچھے چھوڑ جائے۔

زید بن ثابت کے انتخاب پر عبداللہ بن مسعودؓ کی ناگواری

(۷) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ

ابراہیم نخعی سے نقل کرتے ہیں کہ جب (عثمانؓ نے اپنے مرتب کردہ قرآن کے علاوہ) باقی تمام مصاحف کو پھاڑ ڈالنے کا حکم دیا تو عبداللہ ابنِ مسعودؓ نے کہا۔ " لوگو! اپنے قرآنوں کو چھپا لو۔ کیونکہ جو شخص کچھ چھپا کر رکھے گا، قیامت کے روز اسے اپنے ساتھ لے کر آئے گا اور بہترین چھپانے کی چیز قرآن ہی ہے جسے تم میں سے کوئی قیامت کے روز اپنے ساتھ لے کر آئے۔"

(۸) نیز امام ابنِ ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے زید ابنِ ثابت کے لئے قرآن لکھنے کو ناپسند کیا اور کہنے لگے " اے مسلمانوں کی جماعت! مجھے تو قرآن لکھنے کے کام سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے اور اس کی ذمہ داری ایک ایسے شخص نے لے لی ہے کہ بخدا میں جب اسلام لایا تو وہ ابھی اپنے کافر باپ کے صلب میں موجود تھا (یعنی پیدا ابھی نہیں ہوا تھا)"۔

غور فرمایا آپ نے کہ جمع قرآن کی مذعومہ کوششوں کے سلسلہ میں صحابہؓ کا ردِ عمل کیا بتایا جا رہا ہے؟

(۹) نیز امام ابنِ ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ زر بن جبش سے نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا۔ " میں نے حضورؐ کے دہن مبارک سے ستر (۷۰) سے اوپر سورتیں پڑھی ہیں اور زید بن ثابت ابھی بچہ تھے جن کے سر پر دو زلفیں لہراتی رہا کرتی تھیں۔"

نیز شفیق سے نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا۔ " مَن یَغلل یأتِ بما غل یوم القیٰمۃ" عثمانؓ مجھے کس کی قرأت پر قرآن پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ میں نے خود رسول اللہ صلعم سے ستر سے اوپر سورتیں پڑھی ہیں اور محمد صلعم کے اصحاب جانتے ہیں کہ میں ان میں کتاب اللہ کا سب سے بڑا جاننے والا ہوں اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کو جانتا ہے تو میں سفر کر کے بھی اس کے پاس جاتا۔

(۱۰) نیز امام ابنِ ابی داؤد ابن شہاب زہری کی اسی روایت کو نقل کرنے کے بعد جو نمبر ۱ میں گذر چکی ہے

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن

ابنِ شہاب زہری ہی کی روایت سے انس ابن مالکؓ انصاری سے یہ اضافہ نقل کرتے ہیں کہ آذر بائیجان اور آرمینیہ کے غزوہ میں اہلِ شام اور اہلِ عراق جمع ہوئے اور آپس میں انہوں نے ایک دوسرے کو قرآن سنایا تو اس میں بڑا اختلاف ہوا اور قریب ہو گیا کہ ان میں کوئی فتنہ برپا ہو جائے۔ جب حذیفہ ابن الیمان نے قرآن کے بارے میں ان کے یہ اختلافات دیکھے تو وہ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور کہا لوگ قرآن کے بارے میں بڑا اختلاف کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بخدا مجھے یہ اندیشہ ہو رہا ہے کہ وہ بھی اسی اختلاف

میں مبتلا نہ ہو جائیں جس میں یہود اور نصاریٰ مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عثمانؓ بہت گھبرائے اور انہوں نے حضرت حفصہؓ کے پاس آدمی بھیج کر وہ صحیفہ نکلوایا جو ابو بکرؓ کے حکم سے زید بن ثابتؓ نے جمع کیا تھا۔ اور اس سے کئی مصحف لکھوائے اور ان کو ملک کے گوشوں میں بھیج دیا۔ جب مروان مدینہ کا امیر ہوا تو اس نے حضرت حفصہؓ کے پاس آدمی بھیج کر وہ صحیفے منگائے تاکہ انہیں جلا دے۔

مروان نے حضرت حفصہؓ کے صحیفے جلا دیئے

اُسے یہ اندیشہ تھا کہ لکھنے والے ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرنے لگیں۔ مگر حضرت حفصہؓ نے انکار کر دیا۔ ابنِ شہابؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے سالم بن عبداللہ نے بیان کیا کہ حضرت حفصہؓ کا انتقال ہوا تو مروان نے حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ کے پاس سختی سے کہلا بھیجا کہ ان صحیفوں کو اس کے پاس بھیج دیں۔ چنانچہ جونہی لوگ حضرت حفصہؓ کے جنازے سے فارغ ہو کر لوٹے عبداللہ ابنِ عمرؓ نے وہ صحیفے مروان کے پاس بھیج دیئے۔ مروان نے ان کو الگ الگ کر کے جلا دیا۔ اس اندیشہ سے کہ ان صحیفوں میں کوئی چیز اس کے خلاف نہ ہو جو حضرت عثمانؓ نے لکھا تھا۔

(١١) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ ایوب سے اور وہ ابو قلابہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ایک معلّم کسی شخص کی قرأت کے مطابق تعلیم دیتا تھا۔ اور دوسرا

عہدِ عثمانؓ میں قرآن کیسے جمع کیا گیا؟

معلّم دوسرے شخص کی قرأت کے مطابق۔ بچے قرآن پڑھتے اور آپس میں اختلافات کرتے۔ حتیٰ کہ یہ اختلافات معلّمین تک بلند ہو گئے اور لوگوں نے ایک دوسرے کی قرأت پر تکفیر شروع کر دی۔ حضرت عثمانؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے خطبہ دیا اور کہا۔ "تم لوگ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی قرآن میں اختلاف کرتے ہو اور دوسروں کی تغلیط کرتے ہوئے۔ جو لوگ دوسرے شہروں میں مجھ سے دُور ہیں' ان کی غلطیاں اور اختلافات اور بھی سخت ہیں۔ اے اصحابِ محمدؐ! اتفاق سے کام لو اور لوگوں کے لئے ایک (متفقہ) امام (کتاب اللہ) لکھ دو۔ ابو قلابہ کہتے ہیں کہ مجھ سے مالک بن انسؓ نے بیان کیا (یہ امام مالک بن انسؒ کے دادا ہیں) کہ میں ان لوگوں میں شریک تھا جنھوں نے ان کو قرآن لکھوایا۔ اکثر کسی آیت کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا اور کوئی ایسا آدمی یاد آجاتا تھا جس نے اس آیت کو خود رسول اللہ صلعم سے سیکھا تھا اور بعض مرتبہ وہ شخص موجود نہیں ہوتا تھا یا کسی دیہات میں ہوتا تھا تو اس سے آگے اور پیچھے کی آیتیں لکھ لیتے تھے اور اس آیت کی جگہ چھوڑ

دیتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ شخص خود آجاتا یا اس کو بلوالیا جاتا تھا (اور اس سے پوچھ کر وہ آیت لکھ لی جاتی تھی)۔ جب مصحف لکھنے سے فراغت ہوگئی تو حضرت عثمانؓ نے تمام شہروں میں لکھ دیا کہ میں نے ایسا ایسا کام کیا ہے اور جو کچھ میرے پاس تھا میں نے اس کو مٹا دیا ہے۔ لہٰذا، جو کچھ (اس قرآن کے خلاف) تمہارے پاس ہو تم بھی اس کو مٹا دو۔

(۱۲) امام ابنِ ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ مصعب ابن سعد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلعم کو تم سے جدا ہوئے ابھی تیرہ سال ہی گزرے ہیں مگر تم قرآن میں شک کرنے لگے ہو۔ کہتے ہو کہ یہ ابی (ابن کعبؓ) کی قرأت ہے اور وہ عبداللہ (بن مسعودؓ) کی قرأت ہے۔ خدا کی قسم! تو اپنی قرأت ٹھیک نہیں پڑھتا۔ لہٰذا، میں تم میں سے ہر شخص پر لازم کرتا ہوں کہ جس کے پاس بھی کتاب اللہ میں سے کوئی چیز ہو وہ بالضرور اسے میرے پاس لے آئے۔ چنانچہ کوئی کاغذ کا ورق لے کر آتا، کوئی چمڑے کا ٹکڑا لے کر آتا جس میں قرآن لکھا ہوا ہوتا۔ حتیٰ کہ اس طرح بہت کچھ جمع ہوگیا۔ پھر حضرت عثمانؓ اندر آگئے اور ایک ایک آدمی کو بلا بلا کر قسم دے دے کر انہوں نے پوچھنا شروع کیا کہ کیا تم نے اس کو رسول اللہ صلعم سے سُنا ہے۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں یہ کچھ لکھوایا تھا؟ وہ شخص اقرار کرتا۔ حضرت عثمانؓ اس سے فارغ ہوگئے تو لوگوں سے پوچھا تم میں سے بہترین کاتب کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہؐ کے کاتب زید بن ثابتؓ۔ پھر انہوں نے پوچھا تم میں لغتِ عربی کا بہترین ماہر کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ سعید بن العاصؓ۔ تو حضرت عثمانؓ نے کہا ٹھیک ہے۔ سعید لکھوائیں اور زید لکھتے جائیں۔ چنانچہ زید ابنِ ثابتؓ نے قرآن لکھا اور کئی قرآن لکھے اور ان قرآنوں کو عثمان نے لوگوں میں پھیلا دیا۔ ابو قلابہ کہتے ہیں کہ میں نے بعض اصحابِ محمدؐ کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ عثمانؓ نے بہت اچھا کام کیا ہے۔

(۱۳) امام ابن ابی داؤد اپنی دوسری سند سے مصعب ابن سعد ہی سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ابی (ابنِ کعبؓ) اور عبداللہ (ابن مسعودؓ) اور معاذ (ابن جبلؓ) کی قرأت کو سنا تو لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا ابھی تمہارے نبی کی وفات کو پندرہ سال ہوئے ہیں اور تم قرآن میں اختلاف کرنے لگے ہو۔ میں ہر شخص پر لازم کرتا ہوں کہ جس کے پاس بھی قرآن میں کچھ ہو جس نے اُسے خود رسول اللہ صلعم سے سُنا ہو، اسے میرے پاس لے آئے۔ چنانچہ لوگ لکڑی کی تختیاں، ہڈی کے ٹکڑے، کھجور کی چھالیں، جن میں قرآن لکھا ہوا تھا، لانے لگے۔ جو شخص لے کر آتا اس سے حضرت عثمانؓ پوچھ لیتے کہ کیا اس نے یہ کچھ رسول اللہ صلعم سے سنا ہے؟ پھر انہوں

نے لوگوں سے پوچھا تم میں فصیح ترین شخص کون ہے؟ لوگوں نے سعید بن العاص کا نام لیا۔ پھر پوچھا بہترین ماہر کتابت کون ہے؟ لوگوں نے زید بن ثابت کا نام لیا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا زید لکھیں اور سعید لکھوائیں۔ چنانچہ کئی مصحف لکھے گئے اور ان کو مختلف شہروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مصعب بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جس نے عثمانؓ کے اس فعل پر عیب چینی کی ہو۔

(۱۴) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ محمد (ابنِ ابیؒ) سے نقل کرتے ہیں کہ لوگ قرآن پڑھتے تھے اور نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کہتا تھا کہ جو کچھ تو پڑھتا ہے اس سے تو کافر ہو گیا۔ اس کی اطلاع عثمانؓ بن عفانؓ کو کی گئی تو ان کے دل پر بڑی گرانی ہوئی اور انہوں نے قریش اور انصار کے بارہ آدمیوں کو جمع کیا جن میں ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ بھی تھے اور ان سب کو اس صحن میں اکٹھا کر دیا جو حضرت عمرؓ کے مکان میں تھا۔ اسی مکان میں قرآن رہتا تھا۔ حضرت عثمانؓ بھی ان لوگوں کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ محمد (ابن ابیؒ) کہتے ہیں کہ مجھ سے کثیر ابن افلح نے بیان کیا جو ان لوگوں کے لئے قرآن لکھنے والوں میں سے ایک تھے کہ اکثر ان بارہ آدمیوں میں اختلاف ہو جاتا تھا تو اس اختلافی آیت کو وہ مؤخر کر دیا کرتے تھے۔ محمد کہتے ہیں کہ میں نے کثیر سے پوچھا کہ تم لوگ اس کو مؤخر کیوں کر دیا کرتے تھے تو انہوں نے بتایا کہ یہ مجھے معلوم نہیں۔ محمد کہتے ہیں کہ میں نے اس بارے میں ایک گمان بنایا ہے۔ تم لوگ اسے یقین نہ بنا لینا۔ میرا گمان یہ ہے کہ جب ان میں کسی آیت کے متعلق اختلاف ہوتا تھا، تو وہ اسے اس لئے مؤخر کر دیتے تھے کہ دیکھیں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو حضورؐ کے ساتھ آپ کے آخری دَور میں شریک رہا ہو تو اس آیت کو اس کے قول کے مطابق لکھ لیں۔

قرآن کی ترتیب حضرت عثمانؓ نے قائم کی تھی

(۱۵) امام ابنِ ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ ابنِ عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے عثمانؓ سے کہا کہ تم نے سورۂ انفال کو جو مثانی میں سے ہے، سورۂ برأت کے ساتھ کیوں رکھ دیا حالانکہ وہ مئین میں سے ہے اور پھر ان دونوں کو سبع طوال میں رکھ دیا ہے۔ ایسا تم نے کیوں کیا۔ عثمانؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف زمانوں میں مختلف عدد والی سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں۔ جب آپؐ پر کچھ وحی نازل ہوتی تو کسی کاتب کو آپ بلا کر فرما دیتے کہ اس آیت کو ایسی ایسی سورۃ میں رکھ دو جس میں ایسا ایسا تذکرہ آیا ہے۔ سورۂ انفال ان سورتوں میں سے ہے جو ابتداءً مدینہ میں نازل ہوئیں اور سورۂ برأت بالکل آخر میں نازل ہوئی ہے مگر دونوں کا قصہ ایک سا ہے۔ مجھے خیال گذرا کہ سورۂ برأت سورۂ انفال ہی کا حصہ ہے۔

حضور صلعم کا انتقال ہوگیا اور ہمیں آپؐ نے یہ نہیں بتایا کہ آیا واقعی یہ اسی کا حصہ ہے بھی یا نہیں؟ اسی وجہ سے میں نے دونوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سطر نہیں لکھی، اور دونوں کو سبع طوال میں رکھ دیا۔

یہاں تک یہ کہا گیا ہے کہ قرآن حضرت عثمانؓ کے عہد میں مرتب ہوا۔ لیکن یہ قرآن کس قسم کا تھا اس کی بابت بھی سُن لیجئے۔

قرآن میں غلطیاں رہ گئیں

(۱۶) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبدالاعلیٰ بن عبداللہ بن عامر قرشی سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ مصحف سے فارغ ہوگئے اور انہوں نے اسے دیکھا تو فرمایا۔ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا مگر اس میں کچھ غلطیاں مجھے نظر آتی ہیں جنہیں عرب لوگ اپنی زبانوں سے ٹھیک کرلیں۔

لیجئے! قرآن عہدِ عثمانی میں مرتب تو ہوا لیکن اس میں بھی غلطیاں رہ گئیں۔ ان غلطیوں کو حضرت عثمانؓ نے درست نہیں کیا بلکہ علیٰ حالہ رہنے دیا کہ عرب خود اپنی زبان سے درست کرلیں گے۔ اور آگے بڑھئے۔

(۱۷) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عکرمہ طائی سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ کے پاس مصحف لایا گیا تو اس میں انہیں کچھ غلطیاں نظر آئیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اگر لکھانے والا بنوہذیل کا اور لکھنے والا بنوثقیف کا کوئی آدمی ہوتا تو اس میں یہ غلطیاں نہ پائی جاتیں۔

(۱۸) سعید ابن جبیر سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا قرآن میں چار حرف غلط ہیں (۱) الصّٰبئون (۵/۶۹) (۲) والمقیمین (۴/۱۶۲)۔ (۳) فَاَصَّدَّقَ وَاکن من الصّالحین (۶۳/۱۰) اور (۴) ان ھٰذٰا نِ لساحران (۲۰/۶۳)

(۱۹) زبیر ابوخالد کہتے ہیں کہ میں نے ابان بن عثمان سے پوچھا کہ آیت والراسخون فی العلم منھم و المومنون یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک والمقیمین الصلوٰۃ و الموتون الزکوٰۃ۔ الآیہ کیسے ہوگیا اور پیچھے رفع لایا گیا ہے اور المقیمین پر نصب ہے۔ ابانؓ نے جواب دیا کہ یہ کاتب کی غلطی ہے پچھلا حصہ لکھا جاچکا تھا۔ اس نے پوچھا آگے کیا لکھوں؟ لکھوانے والے نے کہا المقیمین الصّلوٰۃ لکھو۔ اس سے جو کچھ کہا گیا لکھ دیا۔

(۲۰) عروہ کہتے ہیں کہ قرآن کی غلطیوں کے متعلق میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا۔ ان ھٰذان لساحرانِ

اور والمقیمین الصلوٰۃ والموتون الزکوٰۃ' اور والذین ھادو والصابئون کے متعلق سوال تھا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا۔" بھتیجے یہ کاتبوں کا کام ہے کہ انہوں نے لکھنے میں غلطی کر ڈالی"۔

⁂

حضرت عثمان نے جو مصاحف لکھوائے ان میں سے مدینہ منورہ کے تمام مصاحف خود امام یعنی ان کے اپنے مصحف سے مختلف تھے

(۲۱) خالد ابن ایاس بن صخر ابن ابی الجہم بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے مصحف کو پڑھا ہے اور انہوں نے ان کے مصحف کو اہلِ مدینہ کے مصحفوں سے بارہ مقامات میں مختلف پایا ہے (اس کے بعد "کتاب المصاحف" میں ان اختلافات کی تفصیل دی گئی ہے جسے ہم بغرض اختصار حذف کرتے ہیں)۔

⁂

مختلف شہروں کے لئے جو مصحف لکھے گئے تھے ان میں باہمی اختلاف تھا

(۲۲) اس کے بعد امام ابن ابی داؤد نے ایک مستقل باب میں اپنی سندوں کے ساتھ وہ اختلافات نقل کئے ہیں جو ان مصاحف میں موجود تھے جو مختلف شہروں کے لئے لکھے گئے تھے۔ یہ باب کافی طویل ہے اس لئے ہم ان اختلافات کو یہاں درج نہیں کرتے۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف شہروں کے لئے جو مختلف مصاحف لکھوائے تھے اور جن کا مقصد ہی یہ تھا کہ مصاحف کے اختلافات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ وہ مقصد بھی پورا نہ ہو سکا اور ان تمام کوششوں کے باوجود مختلف شہروں کے مصاحف میں کافی اختلافات باقی رہ گئے۔

⁂

حجاج ابنِ یوسف نے مصحفِ عثمانی میں گیارہ موقعوں پر تبدیلی کی!

(۲۳) امام ابنِ ابی داؤد نے اپنی سندوں کے ساتھ عوف ابنِ ابی جمیلہ سے (ص۴۹ و ص۱۱۷) میں نقل کیا ہے کہ حجاج ابن یوسف ثقفی نے اپنے زمانہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں گیارہ جگہ پر تبدیلیاں کیں۔ (یہ تفصیل بھی اس کتاب میں موجود ہے) اس وقت امت کے پاس جو قرآن ہے وہ وہی ہے جسے حجاج نے مرتب کیا تھا۔

کتاب المصاحف میں (روایات کی سند کے ساتھ) یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے قرآنِ مجید کا نسخہ مرتب کیا، تو مختلف اکابر صحابہؓ کے پاس اپنے اپنے نسخے تھے جن میں بے شمار آیات، ان آیات سے مختلف تھیں جو مصحفِ عثمانی میں درج تھیں۔ واضح رہے کہ کتاب المصاحف کو ایک مستشرق آرتھر جیفری (ARTHUR JEFERY) نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی (اپنی طرف سے اضافہ کردہ حصہ میں) وہ تمام آیات درج کر دی ہیں جو مختلف صحابہ کے نسخوں میں تھیں اور جو مصحفِ عثمانی میں درج شدہ آیات سے مختلف تھیں۔ کتاب المصاحف میں تو اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن جیفری نے جو تفصیل درج کی ہے اس کی رُو سے، ان نسخوں میں مختلف فیہ آیات کی تعداد حسبِ ذیل ہے[1]:

۱۔ حضرت ابنِ مسعودؓ (۱۳۲۲)۔ ۲۔ حضرت ابی بن کعبؓ (۹۵۲)۔ ۳۔ حضرت علیؓ (۸۹)۔ ۴۔ حضرت ابنِ عباسؓ (۱۸۶)۔ ۵۔ حضرت ابو موسیٰؓ (۴)۔ ۶۔ حضرت حفصہؓ (۱۰)۔ ۷۔ حضرت انس بن مالکؓ (۲۴)۔ ۸۔ حضرت عمرؓ (۲۸)۔ ۹۔ حضرت زید بن ثابتؓ (۱۰)۔ ۱۰۔ حضرت ابنِ زبیرؓ (۳۴)۔ ۱۱۔ حضرت عمرو ابن العاص (تعداد معلوم نہیں)۔ ۱۲۔ حضرت عائشہؓ (۱۳)۔ ۱۳۔ حضرت سالمؓ (۲)۔ ۱۴۔ حضرت امِ سلمہؓ (۱۴)۔ اور (۱۵)۔ حضرت عبید ابنِ عمیرؓ (۱۸)۔

یہ مصاحف، صحابہؓ کی طرف منسوب ہیں۔ تابعین کی طرف منسوب مصاحف، نیز ایسے مصاحف جو بے نام ہیں، ان کی تعداد الگ ہے۔

قرآن کے اختلافات، قرأت اور لب و لہجہ کے اختلافات نہیں تھے

عہدِ صحابہ اور عہدِ تابعین میں مصاحف کے اندر جو اختلافات تھے وہ قرأتوں اور لب و لہجہ کے اختلافات نہیں تھے۔ بعض جگہ آیتوں کی آیتیں اور اکثر الفاظ کے الفاظ ایک دوسرے سے بدلے ہوئے یا کم و بیش تھے۔ لب و لہجہ کا اختلاف یہی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک لفظ کو کسی خاص ہیئت سے ادا کرتا ہے تو دوسرا شخص اسی لفظ کو دوسری ہیئت سے ادا کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ دونوں شخصوں کے وطن اور قبیلے مختلف ہوں۔ ایک ہی خاندان اور ایک ہی مقام کے دو لفظوں کے تلفّظ اور طرزِ ادا میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ مگر ان اختلافات کی صورت یہ تھی کہ ایک ایک قبیلہ اور خاندان اور ایک ایک مقام کے لوگوں کے قرآن پڑھنے میں زبردست اختلافات موجود

---

[1] اس کتاب کے سابقہ ایڈیشنوں میں یہ تعداد، کتاب المصاحف کے مطابق درج کی گئی تھی۔

تھے۔ اس کے ثبوت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سنیئے۔ یہ روایت کتاب المصاحف کے علاوہ خود صحیح بخاری میں بھی جلد ۳، صـ۵۲ پر موجود ہے۔ روایت کا لفظی ترجمہ درج ذیل ہے۔

"مسور ابنِ مخرمہ اور عبدالرحمٰن بن عبد قاری حضرت عمرؓ سے سُن کر بیان کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم (ابن حزام) کو رسول اللہ صلعم کی زندگی میں سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے سنا۔ میں نے ان کا پڑھنا سُنا تو وہ بہت سارے ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے جو مجھے رسول اللہ صلعم نے نہیں پڑھائے تھے۔ قریب تھا کہ میں نماز ہی میں ان پر حملہ کر بیٹھوں مگر میں نے بمشکل صبر کیا۔ حتّٰی کہ انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے انہیں انہی کی چادریں کس لیا اور میں نے ان سے پوچھا کہ یہ سورت جو میں نے تمہیں پڑھتے ہوئے سنی ہے تمہیں کس نے پڑھائی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے تو رسول اللہ صلعم نے پڑھائی ہے۔ میں نے کہا تو جھوٹ بولتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم نے خود مجھے اس کے خلاف پڑھائی ہے جو تو پڑھ رہا تھا اور میں اس کو کھینچتا ہوا رسول اللہ صلعم کی طرف لے چلا اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کہا کہ میں نے اس کو سورۂ فرقان کو ایسے الفاظ میں پڑھتے ہوئے سُنا ہے جو آپ نے مجھے نہیں پڑھائے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا" انہیں چھوڑ تو دو۔ ہشام! پڑھو" چنانچہ ہشام نے اسی طرح رسول اللہ صلعم کے سامنے پڑھ دیا جیسا کہ میں نے پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "یونہی تو نازل ہوئی ہے" پھر فرمایا۔ عمر! اب تم پڑھو۔ چنانچہ جس طرح حضورؐ نے مجھے پڑھائی تھی میں نے پڑھ کر سنائی تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا "یوں بھی نازل ہوئی ہے" اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ یہ قرآن تو سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ لہٰذا جس طرح آسان ہو پڑھ لیا کرو" (صحیح بخاری، جلد سوم، صـ۵۲، باب ۱۹، حدیث نمبر ۳۵، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور)

آپ کو حیرت ہوگی کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی قریشی ہیں اور مکّہ کے رہنے والے ہیں اور ہشام ابنِ حکیم بھی قریشی ہیں اور مکّی ہیں۔ دونوں کی زبان ایک ہے، دونوں کا لب و لہجہ ایک ہے۔ ایک خاندان اور ایک ہی مقام کے دونوں آدمی سورۂ فرقان کو اس قدر اختلاف کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ان پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بمشکل نماز ختم ہونے تک صبر کرتے ہیں اور نماز کے بعد انہی کی چادر میں کس کر گھسیٹتے ہوئے رسول اللہ صلعم کے پاس لاتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم دونوں سے وہ سورۃ سنتے ہیں۔ ہشام بن حکیم سے سُن کر بھی کہتے ہیں کہ ہاں! یونہی تو نازل ہوئی ہے اور پھر حضرت عمرؓ سے سُن کر بھی فرما دیتے ہیں کہ ہاں یوں بھی نازل ہوئی ہے۔ اور پھر ساتھ ہی یہ بھی کہ قرآن تو

سات حرفوں پر نازل ہوا ہے. جس طرح آسان ہوا کرے پڑھ لیا کرو. ان روایات کی بنا پر علامہ سیوطی تفسیر اتقان میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ

بہت سے عوام جو یہ نقل کرتے ہیں کہ اس سے مراد سات قرأتیں ہیں یہ بہت ہی بُری جہالت ہے.

اس پر اتقان کا محشی لکھتا ہے.

اس حدیث سے ان لوگوں کے قول کی تقویت ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حروف سے مراد، مرادف الفاظ کے ساتھ معنوں کا ادا کر دینا ہے خواہ وہ ایک ہی لغت سے کیوں نہ ہو کیونکہ یہاں ہشام کا لغت قریش ہی کی زبان تو ہے اور ایسے ہی عمرؓ کا لغت بھی اور اس کے باوجود دونوں کے پڑھنے میں اختلاف ہو رہا ہے. ابن عبدالبرؒ نے ایسا ہی کہا ہے اور اکثر اہلِ علم سے یہی منقول ہے کہ سات حرفوں سے مراد یہی ہے. (عمدۃ القاری، شرح بخاری للعینی، جلد ۲، ص۲۱)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یہ اختلافات صرف لب و لہجہ اور قرأتوں کے اختلافات نہیں تھے. بلکہ مرادف الفاظ کے ساتھ مطلب اور معنی ادا کر دینے کے اختلافات تھے. ہر شخص کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ قرآن کے معنی اور مضمون کو اپنے الفاظ میں جس طرح چاہے بیان کر دے.

قرآن بھی روایت بالمعنیٰ ہے

روایات پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ تھا کہ جو کچھ روایتوں میں بیان کیا جا رہا ہے، یہ حضور اکرمؐ کے الفاظ نہیں ہیں. روایت بالمعنیٰ ہے. یعنی راوی رسول اللہؐ کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے. اس لئے معلوم نہیں آپؐ نے کیا فرمایا تھا اور سننے والے نے اپنے الفاظ میں اس کو کس طرح نقل کر دیا. اس اعتراض سے بچنے کے لئے عجم کی سازش نے قرآن کریم کو بھی بالکل اسی سطح پر لا کر رکھ دیا ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں ہر شخص کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ قرآن کے معنی اور مضمون کو اپنے الفاظ میں جن مرادف الفاظ کے ساتھ چاہے بیان کر دے. مختصراً یہ کہ ان روایات کی رُو سے موجودہ قرآن حضور اکرمؐ صلعم نے مرتب نہیں کیا تھا نہ اس کو لکھوایا تھا. صحابہؓ کے زمانے میں حضرت ابوبکرؓ نے، عمرؓ نے، عثمانؓ نے یا زید بن ثابتؓ نے اسے لکھا اور مرتب کیا جس میں غلطیاں بھی رہ گئیں. حجاج ابنِ یوسف نے اپنے زمانے میں گیارہ مقامات پر اصلاح کی. نتیجہ ظاہر ہے کہ جو قرآن آج ہمارے پاس موجود ہے وہ قرآن کے معنی اور مضمون کی وہ تعبیر ہے جو حضرت عثمانؓ نے اپنے الفاظ (یا دیگر صحابہؓ کے الفاظ میں) دی تھی اور حجاج ابنِ یوسف نے اس کی

اصلاح کی تھی۔

اختلافِ قرأت کا مفہوم جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، روایات میں وہ آیات بھی درج ہیں جو مختلف صحابہؓ کی طرف منسوب مصاحف میں تھیں۔ ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اختلاف کس قسم کا تھا۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

آیات کے ان اختلافات کو "اختلافِ قرأت" کہتے ہیں۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ "قرأتِ ابن عباسؓ میں یوں آیا ہے۔" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کا جو نسخہ حضرت ابنِ عباسؓ کے پاس تھا، اس میں یہ آیت اس طرح درج تھی۔

مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے سلسلہ میں، قرآن کریم (سورۃ النسآء) میں، ان رشتوں کی تفصیل دینے کے بعد جن سے نکاح حرام ہے، کہا گیا ہے۔

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ

(۴/۲۴)

اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں اس طرح کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ساتھ چاہو نکاح میں لا کر، نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے۔ سو تم ان میں سے جس کے ساتھ نفع اٹھانا چاہو تو انہیں ان کے مقرر کردہ مہر دے دو۔

سنیوں کے ہاں اس معاہدہ کا نام نکاح ہے جو مہر ادا کر کے، دائمی طور پر کیا جاتا ہے اور جو موت یا طلاق سے فسخ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس شیعہ حضرات متعہ کے قائل ہیں جس میں ایک مرد اور ایک عورت، ایک مدتِ معینہ کے لئے، مباشرت کا معاملہ طے کر لیتے ہیں اور اس کے لئے اس عورت کو جنسی تعلق کا معاوضہ دے دیا جاتا ہے۔ سنیوں کے ہاں متعہ حرام ہے (تفصیل اس کی ایک سابقہ باب میں دی جا چکی ہے)۔

اس تمہید کے بعد آگے بڑھئے۔ حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ سنیوں کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کی قرأت (مصحف) میں مندرجہ بالا آیت یوں آئی ہے۔

فاستمتعتم به منهن الی اجلٍ مسمّٰی...

تم ان سے ایک مدتِ معینہ کے لئے فائدہ اٹھاؤ۔

یعنی اس قرأت کی رُو سے آیت قرآنی میں "الیٰ اجلٍ مسمیٰ" کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں متعہ کی سند مل جاتی ہے. اب دیکھئے کہ اس اضافہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کیا فرماتے ہیں. سنّیوں کی سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تفسیر، تفسیر طبری ہے. (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) وہ اس آیت (۴/۲۴) کی تفسیر میں لکھتے ہیں.

> ابو نضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابنِ عباسؓ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا. انہوں نے کہا کہ کیا تم سورۂ نساء کی تلاوت نہیں کرتے. میں نے کہا. کیوں نہیں. کہا، پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ فاستمتعتم بہٖ منھن الیٰ اجلٍ مسمّٰی". میں نے کہا. نہیں. میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا. انہوں نے کہا. اچھا. تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اصلی آیت یونہی ہے. عبدالعلی کی روایت میں بھی ابو نضرہ سے اس طرح کا واقعہ منقول ہے. تیسری روایت میں بھی ابو نضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباس کے سامنے یہ آیت پڑھی. فما استمتعتم بہٖ منھن. ابن عباسؓ نے کہا. الیٰ اجلٍ مسمّٰی. میں نے کہا کہ میں تو اس طرح نہیں پڑھتا. انہوں نے تین مرتبہ کہا. "خدا کی قسم! خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے".

اسے کہتے ہیں اختلافِ قرأت. یعنی (روایات کی رُو سے) حضرت ابنِ عباسؓ (اور دیگر صحابہؓ) کا دعویٰ تھا کہ وہ آیات اسی طرح نازل ہوئی تھیں جس طرح ان کے صحیفوں میں درج ہیں، نہ اس طرح جس طرح وہ مصحفِ عثمانی میں مذکور ہیں. کہا جائے گا کہ اس ساری "سازش" کا مدار "کتاب المصاحف" ہے اسے کس طرح مستند تسلیم کیا جاتا ہے؟ لیکن صاحبِ کتاب المصاحف نے اپنی کتاب میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا. انہوں نے اختلافِ قرأت سے متعلقہ روایات کو کتبِ احادیث سے اکٹھا کر کے ایک جا مرتب کر دیا ہے. اور یہ کتبِ احادیث وہ ہیں جنہیں ہمارے ہاں مستند تسلیم کیا جاتا ہے.

اور سب سے بڑی "سند" یہ کہ ہمارے علماء کرام اس "اختلافِ قرأت" کے قائل ہیں. چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان کی تفاسیر میں اکثر لکھا ہوتا ہے کہ (مثلاً) قرأت حضرت ابنِ عباسؓ میں یوں آیا ہے. ہم اس کی ایک مثال یہاں درج کرتے ہیں.

یہ سب کو معلوم ہے کہ سنّی حضرات وضوء میں پاؤں دھوتے ہیں اور شیعہ حضرات پاؤں پر مسح کرتے ہیں. ایک صاحب نے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے دریافت کیا کہ ان میں کون سا طریقہ قرآن کے مطابق ہے.

مودودی صاحب نے اس کے جواب میں (جو ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا) پہلے قرآن کریم کی متعلقہ آیت درج کی جو حسبِ ذیل ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (۵/۶)

اس کے بعد تحریر فرمایا۔

"اس میں لفظ وَاَرْجُلَكُمْ کی دو قرأتیں متواتر ہیں۔ نافع، ابنِ عامر، حفص، کسائی اور یعقوب کی قرأت وَاَرْجُلَكُمْ (بفتح لام) ہے اور ابنِ کثیر، حمزہ، ابو عمرو اور عاصم کی قرأت وَاَرْجُلِكُمْ (بکسر لام)۔ ان میں سے کسی قرأت کی حیثیت بھی یہ نہیں ہے کہ بعد میں کسی وقت بیٹھ کر نحویوں نے اپنے اپنے فہم اور منشا کے مطابق الفاظِ قرآنی پر خود اعراب لگا دیئے ہوں۔ بلکہ یہ دونوں قرأتیں متواتر طریقے سے منقول ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلی قرأت اختیار کی جائے تو وَاَرْجُلَكُمْ کا تعلق فَاغْسِلُوا کے حکم سے جڑتا ہے اور معنی یہ ہو جاتے ہیں۔ "اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک" اور اگر دوسری قرأت قبول کی جائے تو اس کا تعلق وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ سے قائم ہوتا ہے اور معنی یہ نکلتے ہیں "اور مسح کرو اپنے پاؤں پر ٹخنوں تک"۔

یہ صریح اختلاف ہے جو ان دو معروف و مشہور اور متواتر قرأتوں کی وجہ سے آیت کے معنی میں واقع ہو جاتا ہے۔ اس تعارض کو رفع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں قرأتوں کو کسی ایک ہی مفہوم (غسل یا مسح) پر محمول کیا جائے۔ لیکن اس کی جتنی کوششیں بھی کی گئیں وہ ہمیں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچاتیں۔ کیونکہ جتنے وزنی دلائل کے ساتھ ان کو غسل پر محمول کیا جاسکتا ہے قریب قریب اتنے ہی وزنی دلائل مسح پر محمول کرنے کے حق میں بھی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ محض قواعدِ زبان کی بنا پر ان میں سے کسی ایک معنی کو ترجیح دی جائے۔ لیکن یہ صورت بھی مفید مطلب نہیں۔ کیونکہ دلائل ترجیح دونوں پہلوؤں میں قریب قریب برابر ہیں۔ اب آخر اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عمل کو دیکھا جائے"۔

اور اس کے بعد لکھا۔

قرآن کے الفاظ سے جو بات واضح نہ ہوتی ہو اسے سمجھنے کے لئے اس ذریعہ سے زیادہ معتبر ذریعہ

اور کون سا ہو سکتا ہے۔

قطعِ نظر اس کے کہ شیعہ حضرات اسی "معتبر ذریعہ" کی رُو سے پاؤں پر مسح کرتے ہیں اور سنّی حضرات کا دعویٰ ہے کہ وہ بھی اسی "معتبر ذریعہ" کی رُو سے پاؤں دھوتے ہیں۔ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ قرآنی آیت کی دونوں قرأتیں متواتر ہیں اور ایسی مستند کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی ردّ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ (مودودی صاحب کے) ارشاد کے مطابق قرآن کریم کی یہ آیت ارجلکم کے لَ کے زَبر کے ساتھ بھی نازل ہوئی تھی اور زِیر کے ساتھ بھی۔ اور دونوں کا یہ اختلاف اس قدر اہم ہے کہ ایک قرأت کی رُو سے پاؤں دھونے کا حکم ملتا ہے اور دوسری قرأت کی رُو سے پاؤں پر مسح کرنے کا۔ اور اس طرح "قرآن کے الفاظ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی"۔

آپ سوچئے کہ اس کے بعد، قرآنِ مجید کے متعلق کیا تصوّر قائم ہوتا ہے، اور ہم جو دنیا کے سامنے یہ دعوے پورے حتم و یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اس کتاب میں ایک حرف اور نقطہ کا بھی تغیّر و تبدّل نہیں ہوا۔ اس دعوے کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ اور اس کے بعد سوچئے کہ ایسی کتاب نازل کرنے والے (خدا) کے متعلق (معاذاللہ) کیا تصوّر قائم ہوتا ہے، جو متضاد احکام نازل کر دیتا ہے؟ اور اگر خدا نے اس آیت کو ایک ہی شکل میں نازل کیا تھا۔ یعنی لَ کے زِیر یا زَبر کے ساتھ ــــ تو اگلی صورت یہی سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذاللہ) کسی کو لَ کے زِیر کے ساتھ بتا دیا اور کسی کو زَبر کے ساتھ۔ اس صورت میں سوچئے کہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق (معاذاللہ) کیا تصوّر سامنے آتا ہے۔ اور اگر یہ صورت بھی نہیں تھی تو پھر فرمائیے کہ یہ دو قرأتیں کس طرح وجود میں آئیں؟

آگے چل کر مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

> اب عقل کے لحاظ سے دیکھئے تو پاؤں دھونے ہی کا عمل زیادہ معقول اور قرآن کے منشار کے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔ (یعنی لَ کے زَبر والی آیت کے مطابق)۔

لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے بعد لَ کے زِیر والی قرأت کا کیا بنے گا جو اُسی طرح متواتر اور مستند ہے جس طرح لَ کے زَبر والی قرأت!

یہ ہے اختلافِ قرأت سے مراد جس کی تائید اور سند سینکڑوں روایات میں ملتی ہے اور جو ہمارے ہاں متواتر عقیدہ چلا آ رہا ہے۔

ذرا اپنے دلوں کو ٹٹولیے

کتاب المصاحف ایک سو پچانوے صفحات پر پھیلی ہوئی ضخیم کتاب ہے. پوری کتاب کا نقل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے. جن حضرات کو شوق ہو وہ روایات کے اس مہتم بالشان خزانے کو خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں. لیکن ہم اپنے ان ناظرین سے جن کے دل میں ایمان اور احترامِ قرآن کی ایک ننھی سی چنگاری بھی روشن ہے' مندرجہ بالا اقتباسات کو پیش کرنے کے بعد صرف اتنا سوال کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ذرا اپنے دلوں کا جائزہ لے کر اتنا بتائیں کہ ان اقتباسات کو پڑھنے کے بعد قرآن کریم کے متعلق ان کا کیا تصوّر پیدا ہوتا ہے. کیا ایسی کتاب جس کے متعلق آپ نے یہ کچھ پڑھا ہے' خدا کی کتاب کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے اور کیا اس کے متعلق یہ دعوے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی طرف سے ہے اور وہ آج تک محفوظ ہے." اور یہ وہی کتاب ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی اور جسے رسول اللہ صلعم نے خدا کی طرف سے امتِ محمدیہؐ کو دیا تھا.

سوچئے' اور ٹھنڈے دل سے سوچئے اور بتائیے کہ آخر اس کتاب اور تورات اور انجیل میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے.

تورات' انجیل اور دیگر مذاہب کی مبینہ آسمانی کتب کے خلاف آپ سب سے بڑا اعتراض یہی وارد کرتے ہیں (اور اسی کی بنا پر آپ انہیں غیر یقینی قرار دیتے ہیں) کہ ان کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حرفاً حرفاً وہی ہیں جو ان مذاہب کے پیغمبروں نے اپنی امت کو دی تھیں. آپ نے دیکھ لیا کہ ان روایات نے کس طرح قرآن کو بھی اسی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں دیگر مذاہب کی کتابیں تھیں. دیکھ لیجئے کہ عجم کی یہ سازش کس طرح کامیاب ہوئی؟ چنانچہ آج غیر مسلم مستشرقین انہی روایات کو سامنے لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی روشنی میں بتائیے کہ تم قرآن کی حفاظت کا دعوے کس طرح ثابت کر سکتے ہو؟ آپ کو معلوم ہے کہ یہی "کتاب المصاحف" جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے' شائع کس طرح سے ہوئی ہے؟ ایک فاضل مستشرق ہے (ARTHUR JEFERY) اس نے کیا یہ ہے کہ قرآن کے متعلق جس قدر اختلافات ہماری کتبِ روایات میں پائے جاتے ہیں ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے شائع کر دیا ہے. کتاب کا نام ہے.

(MATERIAL FOR THE HISTORY OF THE TEXT OF QURAN)

ؔ یہ کتاب (E.J.BRILL) پبلشرز لیڈن سے مل سکتی ہے.

اس کے ساتھ ہی اس نے اس خیال سے کہ مبادا یہ کہہ دیا جائے کہ ایک غیر مسلم (عیسائی) نے معاندانہ طور پر "غیر مستند چیزوں" کو جمع کر دیا ہے. امام ابنِ ابی داؤد کی "کتاب المصاحف" کو من وعن شائع کر دیا ہے جس میں وہ تمام احادیث موجود ہیں جو ان اختلافات کی سندیں ہیں اور اس طرح ساری دنیا پر ظاہر کر دیا کہ یہ ہے اس کتاب کی حقیقت جس کے متعلق مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے لے رکھی ہے.

یہ ہیں عجم کی وہ سازشیں جن کی بنا پر اس نے خود قرآن کے متعلق یہ خیال عام کر دیا کہ یہ کونسی محفوظ کتاب ہے؟ انہی سازشوں کا اثر ہے کہ آج جب یہ کہا جاتا ہے کہ اگر احادیث دین کا غیر متبدّل جزو تھیں تو رسول اللہ کو چاہیئے تھا کہ انہیں بھی قرآن کی طرح محفوظ شکل میں امت کو دے کر جاتے' ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے جواب یہ دیا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ' معاذ اللہ) قرآن کون سا محفوظ تھا جو تم احادیث کے خلاف ایسا اعتراض وارد کرتے ہو؟ توبہ! توبہ!! پناہ بخدا ــ آج مسلمان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ خود قرآن ہی کے متعلق اعلان کرتا ہے کہ وہ بھی محفوظ شکل میں امت کو نہیں ملا تھا. ؏

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟

غور فرمایا آپ نے کہ عجم کی محولہ بالا سازش کس قدر گہری تھی اور اس کا اثر کس قدر دُور رس ہے! اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا قدامت پرست طبقہ جو ان روایات کا پاسبان ہے حاملِ دینِ متین اور محافظِ شرعِ مبین قرار پا رہا ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا سے ڈرو اور اس قسم کی اسلام سوز باتیں رسول اللہ کی طرف تو منسوب نہ کرو" اسے ملحد' بے دین' مرتد اور نہ جانے کیا کیا کچھ ٹھہرا دیا جاتا ہے؟ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ آج (غیر مسلموں کی طرف سے نہیں بلکہ خود) مسلمانوں (اور مسلمانوں میں سے بھی ان کے دین کے محافظ "علمائے کرام") کی طرف سے یہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ ہم ثابت کریں کہ قرآن واقعی محفوظ کتاب ہے اور یہ مطالبہ اس طرح سے کیا جاتا ہے' گویا ان کا قرآن سے کوئی رشتہ یا تعلق نہیں. قرآن کا رشتہ صرف ہم سے ہے. اس لئے اس کی ذمہ صرف ہم پہ ہے کہ ہم ثابت کریں کہ قرآن محفوظ کتاب ہے جب حالت یہاں تک پہنچ جائے تو آپ ہی بتلایئے کہ

آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے؟

ہمارے لئے یہ ثابت کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ جو قرآن اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے' اسے

اسی شکل اور اسی ترتیب کے ساتھ مدوّن، مرتب اور جمع کر کے رسول اللہؐ نے امت کو دیا تھا اور اس میں آج تک ایک حرف کا بھی ردّ و بدل نہیں ہوا۔ نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے ہم اس دعوے کو خود قرآنِ کریم سے، اور تاریخ کی شہادات سے، بلکہ غیر مسلم مؤرخین اور مصنفین کی شہادات سے، ثابت کر سکتے ہیں. لیکن یہ چونکہ ایک جداگانہ موضوع ہے اس لئے اسے اس مقام پر سامنے نہیں لایا جاتا۔[1] اس وقت صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ ہماری کتبِ احادیث میں خود قرآنِ کریم کے متعلق کس کس قسم کی روایات موجود ہیں.

[1] اس حقیقت کو شرح و بسط سے ایک الگ کتاب میں بیان کیا گیا ہے جس کا نام ہے "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں"۔

رسول اللہؐ حنفی تھے یا شافعی؟

مولوی صاحب کی طرف سے کہا یہ جاتا ہے کہ دین "کتاب وسنّت" کے مجموعہ کا نام ہے اور سنّت سے مراد ہیں رسول اللہؐ کے وہ اقوال واعمال جو احادیث کے مروّجہ مجموعوں میں منقول ہیں (جنہیں نہ رسول اللہؐ نے اُمّت کو دیا اور نہ ہی صحابہؓ نے مرتب فرمایا)۔ یہ مجموعے کن رجحانات کے تحت مرتب کئے گئے تھے (اور کئے جاتے ہیں) اس کا اندازہ اس تبصرہ سے لگایئے جو احادیث کے ایک تازہ مجموعہ "زجاجۃ المصابیح" پر صدق (لکھنؤ) کی ۹ اکتوبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے۔

> خطیب تبریزیؒ کی مشکوٰۃ المصابیح سے دینداروں میں ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ حدیث نبویؐ کا یہ مستند کارآمد اور نسبتاً مختصر ہونے کے باوجود بڑی حد تک جامع مجموعہ صدیوں سے ہندوستان میں چلا آرہا ہے اور عوام وخواص سب کے حق میں شمع ہدایت کا کام دے رہا ہے لیکن صاحبِ مشکوٰۃ باوجود اپنی جلالۃ القدر کے بہرحال حنفی المذہب نہ تھے، شافعی تھے اس لئے شافعی مذہب کی رعایت کا ان کی کتاب میں جابجا آجانا بالکل قدرتی تھا اور اس کے لئے علماء حنفیہ ایک اسی قسم کے دوسرے مجموعۂ احادیث کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جس میں رعایت ان کے مسلک ومشرب کی ہو۔ صدیوں کے بعد اس ضرورت کے عملاً پورا کرنے کی سعادت اس حیدرآبادی فاضل کے حصّہ میں آئی ہے۔

یعنی مشکوٰۃ المصابیح اس مقصد کے ماتحت مرتب کی گئی تھی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ شافعیؒ مسلک عین مطابق سنّت ہے۔ یہ بات حنفیہ کو بہت کھلتی تھی۔ اب یہ نیا مجموعہ یہ ثابت کرنے کے لئے مرتب کیا گیا ہے کہ حنفی مذہب سنّتِ رسول اللہؐ

کے مطابق ہے۔ بالفاظِ دیگر مشکوٰۃ المصابیح یہ ثابت کرنے کے لئے مدوّن کی گئی تھی کہ رسول اللہ شافعی المذہب تھے اور اب زجاجۃ المصابیح یہ ثابت کرنے کے لئے مرتّب کی گئی ہے کہ حضورؐ حنفی المسلک تھے۔

حنفی اور اہلِ حدیث، دونوں فرقے، متبعینِ حدیث ہیں۔ لیکن ان دونوں میں کس قدر بُعد وتنافر ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ مولانا مفتی محمد حسن (مرحوم) مولانا شاہ اشرف علی تھانوی (مرحوم) کے خلیفہ اور مدرسہ جامعہ اشرفیہ، لاہور کے بانی تھے۔ مولانا جمیل احمد صاحب نے ان کا حسبِ ذیل واقعہ، ہفتہ وار خدام الدین (لاہور) کی ۱۴ جون ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں لکھا ہے۔

> حضرت مفتی صاحب اصل میں ہزارہ کے رہنے والے تھے۔ بعدازاں عمر شریف کا ایک حصہ امرتسر میں گزارا اس لئے امرتسری مشہور ہوئے۔ امرتسر میں رہتے ہوئے آپ نے حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نور اللہ سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ چونکہ تم نے احادیث مبارکہ اہلِ حدیث صاحبان سے پڑھی ہیں۔ اور میں حنفی ہوں۔ جوڑ پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا آپ پہلے کسی حنفی عالم سے حدیث پڑھیں، پھر درخواستِ بیعت کریں۔ اس پر حضرت مفتی صاحب نے تین سال دیوبند میں تعلیم میں صرف فرمائے۔ اس کے بعد حضرت نے بیعت فرمایا۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے مسلمانوں کے دو بڑے (حدیث ماننے والے) فرقوں کا باہمی توافق! یعنی اگر کوئی شخص کسی اہلِ حدیث عالم سے حدیث پڑھتا ہے تو ایک حنفی عالم اور بزرگ اسے بیعت نہیں کرتا جب تک وہ حنفی علماء سے حدیث نہ پڑھے۔

بہرحال یہ ہیں وہ احادیث کے مجموعے جنہیں دین قرار دیا جاتا ہے اور ان مجموعوں کی کیفیت یہ ہے کہ سُنّیوں کے مجموعے یہ ثابت کرتے ہیں کہ رسول اللہ سنّی تھے اور شیعوں کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضورؐ شیعہ تھے۔ پھر سنّیوں میں ایک مجموعہ یہ ثابت کرنے کے لئے مرتّب کیا گیا کہ رسول اللہ شافعی المسلک تھے اور دوسرا یہ ثابت کرنے کے لئے مرتّب کیا گیا ہے کہ آپ حنفی المذہب تھے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن۔ یاد رکھئے! جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا ہے کہ آپ نہ یہودی تھے نہ نصرانی۔ اس طرح رسول اللہ نہ شیعہ تھے، نہ سنّی۔ نہ مقلّد تھے نہ غیر مقلّد۔ نہ شافعی تھے نہ حنفی۔ حضورؐ صرف مسلمان تھے اور آپ کا مسلک قرآن کا مسلک تھا۔ باقی سب نسبتیں انسانوں کی پیدا کردہ ہیں۔ اور خدا اور اس کا رسولؐ ان سے بری الذمہ ہیں۔ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ خدا کا ارشاد ہے اور اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ، رسول اللہ کا اعلان ـــــ باقی بُتانِ آذری!

بُخاری شریف کی چند احادیث

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ ہمارے احادیث کے مجموعوں میں ایسی ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں کسی طرح بھی حضور نبیِ اکرمؐ کے ارشادات تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کی روایات کی کچھ مثالیں آپ نے گذشتہ صفحات میں دیکھ لی ہیں۔ زیرِنظر عنوان میں ہم اس قسم کی چند روایات بخاری شریف سے نقل کرنا چاہتے ہیں۔ امام بخاریؒ کے مجموعۂ احادیث کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے صحاح ستّہ (حدیث کی صحیح چھ کتابوں) میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے اور اسے "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی قرآن کے بعد اس آسمان کے نیچے سب سے زیادہ صحیح کتاب۔

اس مقام پر اس امر کا دہرادینا ضروری ہے کہ حدیث کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ

> "تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا۔ جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمۂ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملّت سے خروج کے مرادف۔"

(جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث، صـــ۴)
از مولانا محمد اسماعیل صاحب۔ صدر مرکزی
جمعیت اہلِ حدیث۔ مغربی پاکستان۔

آگے چل کر لکھا ہے۔

جبریلؑ، قرآن و سنّت دونوں کو لے کر نازل ہوتے۔ آنحضرتؐ کو سنّت بھی قرآن کی طرح سکھاتے۔

اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ (ص۶)

یعنی ان حضرات کے نزدیک، قرآن اور حدیث دونوں وحی منزل من اللہ ہیں اور جن احادیث کو ائمہ سنّت نے صحیح قرار دے دیا ہے، ان میں سے کسی ایک حدیث کا انکار (یعنی اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ رسول اللہ کی نہیں ہو سکتی) کفر ہے۔ وہ احادیث جنہیں ان ائمۂ سنّت نے صحیح قرار دے دیا ہے، بخاری اور مسلم میں درج ہیں چنانچہ ان کتابوں کے متعلق ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ

بخاری اور مسلم کی احادیث پر امت متفق ہے۔............ اور ان کی صحت قطعی ہے۔

(ایضاً، ص۵۵)

اس تمہیدی تعارف کے بعد آپ دیکھئے کہ بخاری شریف میں (جس کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی، ان حضرات کے نزدیک، ایک مسلمان کو اسلام کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے) کس قسم کی احادیث موجود ہیں۔ بخاری شریف کا اُردو ترجمہ "نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی" نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ہم نے ان احادیث کو لفظاً لفظاً اس کتاب سے نقل کیا ہے اور ہر حدیث کے آخر میں اس کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے۔ حوالہ میں اوپر صفحہ کا نمبر ہے اور نیچے حدیث کا۔ مثلاً (۱۲۹/۴۷۳ جلد دوم) کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کتاب مذکور کی جلد دوم کے صفحہ ۱۲۹ پر ہے اور اس کا نمبر ۴۷۳ ہے۔ عربی دان حضرات، بخاری کا عربی نسخہ ملاحظہ فرمالیں۔ (قارئین کی سہولت کے لئے صحیح بخاری اُردو کے تازہ ایڈیشن مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور سے دوبارہ حوالہ جات دیئے گئے ہیں۔ طلوعِ اسلام ٹرسٹ)۔

اب آپ مثال کے طور پر چند احادیث دیکھئے۔

(۱) انبیائے کرامؑ کے متعلق

پتھر کپڑے لے کر بھاگ گیا ابو ہریرہؓ نبی صلے اللہ علیہ وسلّم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ بنی اسرائیل برہنہ غسل کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنا۔ اور موسٰی علیہ السلام تنہا غسل کیا کرتے تھے تو بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ موسٰی علیہ السّلام کو ہم لوگوں کے ہمراہ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ فتق میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسٰی علیہ السّلام غسل

کرنے لگے۔ اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے کر بھاگا اور حضرت موسیٰؑ بھی اس کے تعاقب میں یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ "ثوبي يا حجر ثوبي يا حجر!" (اے پتھر میرے کپڑے دے دے اے پتھر میرے کپڑے دے دے) یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھ لیا اور کہا کہ واللہ موسیٰؑ کو کچھ بیماری نہیں ہے اور (پتھر ٹھہر گیا) موسیٰؑ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم (حضرت موسیٰؑ کی مارسے) اس پتھر پر چھ یا سات نشان (اب تک باقی ہیں)۔ (صحیح بخاری، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور، جلد اوّل، ص ۲۰۶ حدیث نمبر ۲۷۳، باب ۱۹۳)۔ (۲۶۷/۷۶، جلد اوّل)۔

ملک الموت کے طمانچہ مارا

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ملک الموت حضرت موسیٰؑ کے پاس بھیجا گیا۔ جب وہ آیا تو حضرت موسیٰؑ نے اس کے ایک طمانچہ مارا کہ اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی اور وہ اپنے پروردگار کے واپس گیا۔ اور عرض کیا کہ تو نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا جو مرنا نہیں چاہتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھ دوبارہ اسے عنایت فرمائی اور حکم دیا کہ (حضرت موسیٰؑ کے پاس) پھر جا اور ان سے کہہ کہ وہ اپنا ہاتھ ایک بیل کی پیٹھ پر رکھیں۔ پس جس قدر بال ان کے ہاتھ کے نیچے آئیں گے، ہر بال کے عوض میں ایک سال کی زندگی انہیں دی جائے گی (چنانچہ فرشتہ آیا اور حضرت موسیٰؑ کو پیغام باری سنایا)۔ انہوں نے کہا اے پروردگار پھر (جب وہ سب برس گزر جائیں گے تو) کیا ہوگا؟ اللہ نے فرمایا کہ پھر موت آئے گی۔ انہوں نے کہا کہ ابھی سہی۔ پس انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ انہیں ارضِ مقدس سے بقدر ایک پتھر پھینکنے کے قریب کر دے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے (یہ بیان فرما کر) مزید کہا کہ اگر میں اس مقام پر ہوتا تو تمہیں حضرت موسیٰؑ کی قبر راستہ کی طرف سرخ ٹیلے کے پاس دکھا دیتا۔ (۲۴۰/۲۹۸، جلد اوّل)

(صحیح بخاری، جلد دوم، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور، حدیث نمبر ۴۲۹، باب نمبر ۳۳۳، ص ۳۲۹)۔

لیثؒ کا قول ہے کہ مجھ سے جعفر بن ربیعہ نے عبد الرحمٰن بن ہرمز سے نقل کیا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے حضرت

سو عورتوں کا دورہ

ابو ہریرہؓ کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کرتے ہوئے سنا کہ آپؐ نے فرمایا۔ سلیمان بن داؤد (پیغمبر علیہ السلام) نے (ایک روز) کہا کہ آج شب کو میں سو عورتوں کے پاس یا ننانوے عورتوں کے پاس جاؤں گا۔ وہ سب عورتیں ایک ایک شہسوار پیدا کریں گی جو خدا کی راہ میں جہاد کرے گا۔ تو اُن سے اُن کے ایک ہم نشین نے کہا کہ انشاءاللہ کہو مگر انہوں نے انشاءاللہ نہیں کہا۔ پس ان میں سے صرف ایک عورت حاملہ ہوئی۔ سو وہ بھی آدھا بچہ جنی۔ قسم ہے اس کی

جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے اگر وہ انشاءاللہ کہہ لیتے تو (سب عورتوں کے بچے پیدا ہوتے اور) بے شک وہ سب سوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے۔ (۸۱/۳۰) سے آگے، جلد دوم)' ایضاً۔ حدیث نمبر ۶۴۵' باب نمبر ۲۴۲' ص ۳۳۹)۔

حضرت ابراہیمؑ کا ختنہ

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنا ختنہ ایک بسولے سے کیا وہ اس وقت اسّی برس برس کے تھے۔ (۱۵۱/۵۷۸۔ جلد دوم)۔ (اس حدیث میں کتابت کی ایک غلطی کی تصحیح کی گئی ہے)۔ (صحیح بخاری، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور، جلد دوم، حدیث نمبر ۵۷۹، باب ۳۱۲، ص ۲۹۸)۔

حضرت ابراہیمؑ کے جھوٹ

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابراہیمؑ کبھی جھوٹ نہیں بولے سوا تین مرتبہ کے۔ دو مرتبہ تو خدا کے واسطے ان کا کہنا کہ إِنِّي سَقِيمٌ (یعنی میں بیمار ہوں) اور یہ کہنا بَلْ فعله كَبِيرُهُمْ هٰذَا (میں نے یہ کام نہیں کیا بلکہ ان سب میں جو یہ بہت بڑا بُت ہے اس نے یہ کیا ہے)۔ یہ تو خدا کے لئے تھا اور آپ نے فرمایا کہ ایک دن اس حال میں کہ وہ اور سارہ جا رہے تھے کہ ایک ظالم بادشاہ پر ان کا گذر ہوا۔ کسی نے اس سے کہا کہ یہاں ایک شخص (آیا) ہے اس کے ہمراہ ایک عورت ہے جو خوبصورت لوگوں میں سے ہے۔ پس اس ظالم نے ان کے پاس آدمی بھیجا اور سارہ کی بابت ان سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہہ دیا کہ میری بہن ہے۔ پھر وہ سارہ کے پاس گئے اور کہا کہ اے سارہ روئے زمین پر کوئی مومن میرے اور تمہارے سوا نہیں ہے اور اس ظالم نے مجھ سے پوچھا تھا تو میں نے کہہ دیا کہ میری بہن ہے۔ پس تم مجھے جھوٹا نہ کرنا۔ پھر اس ظالم نے سارہ کو بلوا بھیجا۔ جب سارہ اس کے پاس گئیں اور وہ ان کی طرف ہاتھ بڑھانے لگا تو وہ مرگی میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے (سارہ سے) کہا کہ تم اللہ سے میرے لئے دعا کرو اور (اب) میں تمہیں کچھ ضرر نہیں پہنچاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے اللہ سے دعا کی اور وہ اچھا ہو گیا۔ پھر دوبارہ اس نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر اسی طرح مبتلا ہو گیا۔ یا اس سے بھی زیادہ۔ پھر اس نے (سارہ سے) کہا کہ میرے لئے اللہ سے دُعا کرو۔ (اب) تمہیں ضرر نہ پہنچاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے دعا کی وہ اچھا ہو گیا۔ پس اس نے اپنے کسی دربان کو بلایا اور کہا کہ میرے پاس انسان کو نہیں لایا تو میرے پاس شیطان کو لایا ہے۔ پھر اس نے سارہ کی خدمت کے لئے ہاجرہ کو دیا۔ پھر سارہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئیں اور وہ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کیا ہوا — سارہ نے کہا کہ اللہ نے کافر کا فریب اس کے سینے میں رد کر دیا اور اس نے ہاجرہ کو خدمت کے لئے دیا —

حضرت ابو ہریرہؓ (یہ حدیث بیان کر کے) کہتے تھے کہ اے آسمانی پانی کے بیٹو! یہی تمہاری ماں ہے۔

(۵۷۹ - ۵۸۲/۱۵۰۔ جلد دوم)' (ایضاً' حدیث نمبر ۵۸۲' صہ ۲۹۹)۔

گرگٹ کو قتل کردو

حضرت اُمِّ شریک سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے گرگٹ کے قتل کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ وہ ابراہیمؑ پر آگ روشن کرتی تھی۔ (۵۸۰/۱۵۱۔ جلد دوم)' (ایضاً' حدیث نمبر ۵۸۳' صہ ۳۰۰)۔

حضرت آدم کا قد

حضرت ابو ہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے جب آدم کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز تھا۔ پھر اللہ نے (ان سے) فرمایا کہ جاؤ اور ان فرشتوں کو سلام کرو اور سنو وہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں۔ وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا۔ پس آدم نے کہا۔ السلام علیکم۔ فرشتوں نے جواب دیا۔ السلام علیک ورحمۃ اللہ۔ رحمۃ اللہ انہوں نے زیادہ کردیا۔ پس جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ آدم کی صورت پر ہوگا۔ پھر برابر اب تک قد کم ہوتا رہا۔

(۵۵۰/۱۴۲۔ جلد دوم)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۵۵۱' باب نمبر ۳۰۲' صہ ۲۸۲)۔

نمازیں کیسے فرض ہوئیں

ابنِ حزم کہتے ہیں اور انس بن مالک نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ (شبِ معراج) اللہ نے مجھ پر پچاس نمازیں فرض کیں۔ اس حکم کو لے کر لوٹا یہاں تک کہ موسیٰؑ کے پاس میرا گذر ہوا تو موسیٰؑ نے پوچھا کہ اللہ نے آپ کی اُمّت پر کیا فرض کیا۔ میں نے کہا ان پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔ موسیٰؑ نے کہا کہ آپ اپنے پروردگار سے پھر کہیئے کہ کیونکہ آپ کی امت اتنی طاقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ میں لوٹ گیا اور میں نے اپنے پروردگار سے عرض کیا پھر اس نے ایک حصّہ معاف کردیا۔ پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹا تو انہوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے پھر کہیئے۔ اور انہوں نے ویسا ہی کیا۔ پس اللہ نے ایک حصّہ اور معاف کردیا۔ پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹا تو انہوں نے وہی کہا اور پھر میں نے عرض کیا تو اللہ نے ایک حصّہ اور معاف کردیا۔ پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ آیا۔ اور ان سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ اپنے پروردگار سے پھر کہیئے کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ میں لوٹ گیا اور میں نے پروردگار سے پھر عرض کی۔ اس نے فرمایا کہ (اب) یہ پانچ نمازیں (رکھی جاتی) ہیں اور یہ (ثواب میں) پچاس (کے برابر) ہیں اور میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی۔ پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ کر آیا۔ انہوں نے کہا اپنے پروردگار سے پھر کہیئے تو میں نے کہا کہ مجھے اب اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے۔ پھر جبریل میرے ساتھ چلے۔ یہاں تک کہ مجھے

سدرۃ المنتہٰی میں لائے تو اس پر کچھ رنگ چھائے ہوئے تھے جن کو میں نہیں جانتا تھا کہ کیا تھے پھر میں جنت میں داخل کیا گیا تو وہاں کے سنگریزے موتی تھے اور وہاں کی مٹی مشک تھی۔ (۵۶۵/۱۴۶۔ جلد دوم)'

(ایضاً' حدیث نمبر ۵۶۶' باب نمبر ۳۰' صفحہ ۲۹۰)۔

حضورؐ پر جادو

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر جادو کیا گیا۔ یہاں تک کہ (اس کا اثر) ہوا۔ آپؐ کو خیال ہوتا تھا کہ ایک کام کیا ہے حالانکہ آپؐ نے اس کو نہ کیا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے ایک دن دُعا کی اور (بہت) دعا کی۔ بعد اس کے (مجھ سے) فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے مجھ کو وہ بات بتا دی جس میں میری شفا ہے۔ دو آدمی میرے پاس آئے۔ ان میں سے ایک میرے سر کے پاس اور دوسرا میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس شخص کو کیا بیماری ہے۔ دوسرے نے کہا کہ ان پر جادو کیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ کس نے ان پر جادو کیا؟ دوسرے نے کہا۔ لبید بن اعصم نے' اس نے کہا کہ کس چیز میں؟ دوسرے نے کہا کہ کنگھی میں اور روئی کے گالے میں اور تر چھوہارے کی کلی کے اوپر والے چھلکے میں۔ اس نے کہا کہ وہ کہاں ہے۔ دوسرے نے کہا کہ ذوراں (نامی) کنوئیں میں۔ پس وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم تشریف لے گئے۔ بعد اس کے لوٹے' تو جب آئے آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس (کنوئیں) کے قریب والے درخت گویا کہ شیاطین کے سر ہیں۔ (حضرت عائشہؓ کہتی ہیں) مجھے یہ خیال ہوا کہ لوگوں میں فساد پھیلے گا (اور جادو کا چرچا زیادہ ہو جائے گا) بعد اس کے وہ کنواں بند کر دیا گیا۔

(۴۹۸/۱۳۳۔ جلد دوم)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۴۹۸' باب نمبر ۲۹۵' صفحہ ۲۶۴)

حضورؐ اور ازواجِ مطہراتؓ

انس بن مالک کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی (تمام) بیبیوں کے پاس ایک ہی ساعت کے اندر' رات اور دن میں دَورہ کر لیتے تھے اور وہ گیارہ تھیں۔ قتادہؓ کہتے ہیں میں نے انسؓ سے کہا کیا آپؐ ان سب کی طاقت رکھتے تھے؟ وہ بولے کہ (ہاں بلکہ) ہم کہا کرتے تھے کہ آپؐ کو تیس مردوں کی طاقت دی گئی تھی اور سعید نے قتادہؓ سے نقل کیا ہے کہ انسؓ نے ان سے نو بیبیاں بیان کیں۔ (۲۶۵/۴۲۔ جلد اوّل)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۲۶۳' باب ۱۸۵' صفحہ ۲۶۳)۔

حالتِ حیض میں مباشرت

عائشہ کہتی ہیں میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم ایک ظرف سے غسل کرتے تھے اور ہم دونوں جنب ہوتے تھے اور حالتِ حیض میں مجھے آپ حکم دیتے تھے تو میں ازار پہن لیتی تھی۔ پھر آپؐ مجھ سے اختلاط کرتے تھے اور آپ بحالتِ اعتکاف

اپنا سر میری طرف نکال دیتے تھے اور میں اس کو دھو دیتی حالانکہ میں حائضہ ہوتی تھی۔ (۸۰/۲۸۸۔ جلد اوّل)'
(ایضاً۔ جلد اوّل' حدیث نمبر ۲۸۹' باب ۲۰۴' صـ۲۸۹)۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم مجھ سے مباشرت فرماتے تھے۔ حالانکہ میں حائضہ ہوتی تھی اور اپنا سر آپؐ مسجد سے نکال دیتے تھے، جب آپؐ معتکف ہوتے تھے اور میں آپؐ کا سر دھوتی تھی۔ حالانکہ میں حائضہ ہوتی تھی۔ (۲۵۱/۱۸۷۳۔ جلد اوّل)' (ایضاً۔ جلد اوّل' حدیث نمبر ۱۹۰۱' باب ۲۰۴' صـ۲۱۲)

عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم میں سے جب کوئی بی بی حائضہ ہوتی تھی' اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس سے اختلاط کرنا چاہتے تو اسے حکم دیتے تھے اور اپنے حیض (کے غلبہ) کی حالت میں ازار پہن لے۔ پھر آپ اس سے اختلاط کرتے تھے۔ عائشہؓ نے کہا کہ تم میں سے اپنی حاجت پر کون اس قدر قابو رکھتا ہے جس قدر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش پر قابو رکھتے تھے۔ (۸۰/۲۸۹۔ جلد اوّل)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۲۹۰' باب ۲۰۷' صـ۲۱)

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ آپ کی بیبیوں میں سے کسی بی بی نے (بھی) اعتکاف کیا اور وہ خون اور زردی کو (خارج ہوتے) دیکھتی تھیں اور نماز پڑھنے کی حالت میں طشت ان کے نیچے (رکھا) رہتا تھا۔ (۸۲/۲۹۷۔ جلد اوّل)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۲۹۳' باب نمبر ۲۰۷' صـ۲۱۳)۔

روزے میں

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں (اپنی ازواج کے) بوسے لیا کرتے تھے اور مباشرت کیا کرتے تھے مگر آپ اپنی خواہش پر تم سب سے زیادہ قابو رکھتے تھے۔ (۴۳۰/۱۷۷۹۔ جلد اوّل)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۱۸۰۷' باب نمبر ۱۲۰۷' صـ۲۲۶)

ابو بکر بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں اپنے والد کے ہمراہ حضرت عائشہؓ کے پاس گیا تو انہوں نے کہا کہ میں یقین کے ساتھ بیان کرتی ہوں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر احتلام کے جماع کے سبب سے بہ حالتِ جنابت صبح ہو جاتی تھی۔ پھر آپ اس دن روزہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد ہم حضرت امِ سلمہؓ کے پاس گئے تو انہوں نے بھی ایسا ہی کہا۔ ابو جعفر کہتے ہیں۔ میں نے ابو عبداللہ سے پوچھا کہ اگر روزہ توڑ ڈالے تو کیا جماع کرنے والے کی طرح وہ کفارہ دے گا۔ انہوں نے کہا کہ نہیں کیا تم حدیث کو نہیں دیکھتے کہ ان میں یہ الفاظ صاف موجود ہیں۔ لَمْ يَقْضِهِ وَ إِنْ صَامَ الدَّهْرَ۔ (۴۳۰/۷۸۳۔ جلد اوّل)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۱۸۱۱' باب نمبر ۱۲۰۹' صـ۸۲۷)

(۲) صحابہ کبارؓ کے متعلق

صحابہؓ (معاذاللہ) مرتد ہوگئے تھے حضرت ابن عباسؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا، برہنہ بدن بغیر ختنہ کے حشر کئے جاؤ گے اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیمؑ ہیں اور (اس دن) میرے چند صحابہ بائیں جانب (جہنم کی جانب) لئے جارہے ہوں گے۔ میں کہوں گا۔ یہ تو میرے صحابہ ہیں۔ پھر اللہ فرمائے گا۔ یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے، جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے۔ پس میں کہوں گا جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسیٰؑ) نے کہا تھا۔ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ..... الی قولہ ..... الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (۱۴۹/۵۷۱۔ جلد دوم)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۵۷۲، باب نمبر ۳۱۲، ص۲۹۶)۔

نفاست مسور اور مروان سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے زمانے میں نکلے پھر انہوں نے پوری حدیث ذکر کی اور (اس میں یہ بھی تھا کہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی مرتبہ تھوکا وہ کسی نہ کسی شخص کے ہاتھ پر پڑا اور اس نے اسے اپنے چہرہ اور بدن پر مل لیا۔ (۲۲۱/۶۹۔ جلد اول)'

(صحیح بخاری، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور، جلد اول، حدیث نمبر ۲۳۸، باب ۱۶۸، ص۱۹۳)

---

(۳) عورتوں کے متعلق

عزل حضرت ابو سعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ ایک دن وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہم (جہاد میں) قید کی ہوئی لونڈیوں سے جماع کرتے ہیں۔ چونکہ ہم ان کو بیچنا چاہتے ہیں (اس لئے نہیں چاہتے کہ وہ حاملہ ہو جائیں) پس آپ عزل کی نسبت کیا رائے دیتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کیا تم لوگ ایسا کرتے ہو۔ تم کو کچھ مجبوری نہیں ہے اگر تم ایسا نہ کرو۔ (۲۰۵۷/۲۹۲۔ جلد اول)

(صحیح بخاری، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور، جلد اول، حدیث نمبر ۲۰۸۸، باب نمبر ۱۳۸۴، ص۹۳۶)

ابن محیریز کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید کو دیکھا ہے اور میں نے ان سے (کچھ) دریافت کیا تھا تو انہوں نے کہا غزوہ بنی مصطلیق میں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ گئے تو ہم نے عرب کے قیدیوں میں سے کچھ قیدیوں کو پایا۔ پھر ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی اور تجرد نے ہم پر غلبہ کیا تو ہم نے عزل کی خواہش کی۔ پس ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ اگر تم یہ نہ کرو تو تم کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ قیامت تک جو جان کہ پیدا ہونے والی ہے وہ تو ضرور پیدا ہوگی۔ (۲۳۴۶/۵۷۳، جلد اوّل)

(ایضاً۔ حدیث نمبر ۲۳۴۷، باب ۵۹۵، ص ۲۳۴۲)

شرمگاہ کے علاوہ

عطا کہتے ہیں کہ کچھ حرج نہیں اگر کوئی شخص اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے سوا اور کچھ مباشرت کرے۔ (باب/۴۹۲۔ جلد اوّل)

(ایضاً۔ حدیث نمبر ۲۰۹۳ کا عنوان، باب ۱۳۸۶، ص ۹۳۸)

متعہ

عبداللہؓ بن مسعود راوی ہیں کہ ہم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جہاد میں شریک تھے اور ہمارے ساتھ عورتیں نہ تھیں (اور عورتوں سے جدائی کی برداشت نہ ہوتی تھی، بوجہ حرارت اور قوت کے) تو ہم نے عرض کیا آیا ہم خصی ہو جائیں۔ آپؐ نے منع فرمایا اور پھر اجازت دے دی کہ عورت سے تھوڑے یا زیادہ دن مقرر کر کے جس میں جو عورت راضی ہو نکاح کر لو تاکہ (اس فعل یعنی خصی ہونے سے) بچو اور نگاہ بد کسی پر نہ پڑے۔

(۱۷۱۸/۴۶۸، جلد دوم) (صحیح بخاری، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور، جلد سوم، حدیث نمبر ۶۸، باب ۳۷، ص ۶۵)

زانیہ عورت

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (گذشتہ زمانے میں ایک عورت نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ (حالانکہ اس کا بیٹا اپنے عبادت خانہ میں (نماز پڑھ رہا) تھا۔ اس عورت نے کہا کہ جریج! تو لڑکے نے (اپنے دل میں) کہا کہ اے اللہ (اب میں کیا کروں) میری ماں مجھے پکار رہی ہے۔ اگر نہیں بولتا تو وہ ناخوش ہوگی۔ اور اگر (بولتا ہوں تو) میری نماز (جاتی ہے)۔ پھر دوبارہ اس کی ماں نے کہا کہ اے جریج! اس لڑکے نے (اپنے دل میں) کہا کہ اے اللہ! (اب میں کیا کروں) میری ماں (مجھے پکار رہی ہے۔ اگر نہیں بولتا ہوں تو اس کی ناخوشی کا سبب ہے) اور (بولتا ہوں، تو) میری نماز جاتی ہے۔ پھر تیسری بار اس کی ماں نے کہا۔ اے جریج! (اس نے پھر اپنے دل میں کہا) کہ اے اللہ! (اب میں کیا کروں) میری ماں (مجھے پکار رہی ہے، اگر نہیں بولتا ہوں تو اس کی ناخوشی کا سبب ہے) اور (بولتا ہوں تو) میری نماز جاتی ہے۔ جب تیسری مرتبہ بھی وہ نہ بولا تو اس کی ماں کو غصہ آگیا اور کہنے لگی کہ اے اللہ! جریج کو موت نہ آئے جب

تک زانیہ عورت کی صورت نہ دیکھ لے، اور ایک چرواہے کی عورت اس کے عبادت خانہ کے قریب بکریاں چرانے آیا کرتی تھی۔ اس کے بچہ پیدا ہوا۔ اس سے دریافت کیا گیا یہ بچہ کس سے پیدا ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ جریج سے۔ وہ اپنے عبادت خانہ سے اترا تھا (اور میرے ساتھ ہم بستر ہوا تھا۔ لوگوں نے جاکر جریج سے اس واقعہ کے متعلق باز پُرس کی)۔ جریج نے کہا کہ وہ عورت کہاں ہے جو بیان کرتی ہے کہ اس کا بچہ میرا ہے۔ (لوگ عورت کو جریج کے پاس لائے۔ جریج نے اس بچے سے) کہا۔ اے بابوس! تیرا باپ کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک چرواہا۔ غرض اسی طرح پر جریج کی ماں کی دعا کا اثر ہوا کہ جریج کو ایک زانیہ عورت کی صورت دیکھنی پڑی۔

(باب/۲۶۷، جلد اوّل) (صحیح بخاری، جلد اوّل، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، حدیث نمبر ۱۱۳۳، باب ۷۴۶، ص۵۴۵)

جو عورت انکار کرے

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مرد اپنی بی بی کو ہم بستری کے لئے کہے اور وہ انکار کرے پھر وہ مرد ناخوش ہو کے سو رہے تو فرشتے اس عورت پر صبح تک لعنت کرتے ہیں۔ (۴۶۸/۱۲۸، جلد دوم)

(صحیح بخاری، جلد سوم، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور، حدیث نمبر ۱۸۷، باب ۱۱۵، ص۱۲۰)

دوزخ میں عورتیں

حضرت عمران بن حصین نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں کے لوگوں میں اکثر فقراء پائے اور میں نے دوزخ میں دیکھا تو وہاں کے لوگوں میں اکثر عورتوں کو دیکھا۔ (۴۷۲/۱۲۹، جلد دوم)

(ایضاً۔ حدیث نمبر ۱۸۳، باب ۱۱۸، ص۱۲۳)

بھینگا بچہ

باب اللہ کے اس قول (نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ وَ قَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ) کے بیان میں (ترجمہ) تمہاری بیویاں تمہارے لئے کھیتی ہیں جب جدھر سے دل چاہے ان کے پاس آؤ۔ مباشرت کرو۔ اور اپنی نسلوں کا ذخیرہ جمع کرو۔

نافع مولیٰ ابنِ عمرؓ سے مروی ہے کہ عبداللہ ابنِ عمر قرآن پڑھنے میں کسی سے کلام نہیں کرتے تھے۔ ایک روز قرآن پڑھتے میں ان کے پاس چلا گیا۔ جب وہ سورہ بقرہ پڑھتے میں اس آیت (نسآؤکم) پر پہنچے تو مجھ سے کہا کہ تجھے معلوم ہے یہ آیت کب نازل ہوئی۔ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ انہوں نے اس کا شان نزول بیان کیا اور پھر آگے پڑھنے لگے۔ عبدالصمد کہتے ہیں۔ ابن عمرؓ سے بھی یہ روایت پہنچی ہے کہ بعض آدمی عورتوں سے اغلام کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

جابرؓ سے روایت ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے جو شخص اپنی عورت سے الٹا لٹا کر جماع کرے، اس کی اولاد بھینگی پیدا ہو گی. اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ قول غلط ہے. عورتوں سے جس ہیئت سے چاہو جماع کرو. (۳۲-۳۳/۱۶۳۳/۴۳۳، جلد دوم)، (صحیح بخاری، جلد دوم، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور، احادیث نمبر ۱۶۳۴-۱۶۳۵، باب ۶۰۱، ص ۴۹۸).

---

(۴) معلوماتِ عامہ

سورج کہاں جاتا ہے

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر سے جب کہ آفتاب غروب ہو رہا تھا، یہ فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ یہ کہاں جاتا ہے. میں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول خوب واقف ہے. آپؐ نے فرمایا کہ وہ جاتا ہے تاکہ عرش کے نیچے سجدہ کرے. پھر (اللہ سے) اجازت طلوع کی مانگے گا، تو اسے اجازت طلوع کی دی جائے گی. اور قریب ہے کہ وہ سجدہ کرے اور اس کا سجدہ قبول نہ کیا جائے اور اجازت مانگے اور اسے اجازت نہ ملے. اس سے کہہ دیا جائے کہ جہاں سے تو آیا ہے وہیں لوٹ جا. پس وہ مغرب سے طلوع کرے گا. یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا. وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ. (۴۳۰/۱۲۰، جلد دوم)، (صحیح بخاری، جلد دوم، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور، حدیث نمبر ۴۳، باب ۲۸۸، ص ۲۳۹)

موسم کیسے بدلتے ہیں

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی کہ لے میرے پروردگار! میرے ایک حصہ نے میرے دوسرے حصہ کو کھا لیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی. ایک سانس جاڑوں میں اور ایک سانس گرمی میں (پس تم جو سخت سردی دیکھتے ہو، یہ بھی جہنم کا سانس ہے).

(۴۹۰/۱۳۲، جلد دوم، (ایضاً۔ حدیث نمبر ۴۹۰، باب ۲۹۴، ص ۲۶۲).

نحوست تین چیزوں میں ہے

حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ نحوست صرف تین چیزوں میں ہے. گھوڑے میں، عورت میں اور گھر میں. (۳۷/۱۱۸، جلد دوم)، (ایضاً۔ حدیث نمبر ۱۲۱، باب ۹۲، ص ۹۰).

حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نحوست کسی چیز میں ہو تو عورت میں اور گھوڑے میں اور مکان میں ہوگی۔ (۱۱۹/۳۷، جلد دوم)، (ایضاً)

بیل باتیں کرتا ہے

حضرت ابوہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا اس حالت میں کہ ایک شخص بیل پر سوار تھا۔ وہ بیل اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ میں اس کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ میں تو کھیتی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ حضرت نے (یہ واقعہ بیان کرکے) فرمایا کہ اس پر میں یقین رکھتا ہوں اور ابوبکرؓ و عمرؓ (بھی) یقین رکھتے ہیں۔ اور ایک بھیڑیئے نے ایک بکری پکڑ لی تو چرواہا اس کے پیچھے دوڑا۔ بھیڑیئے نے کہا کہ (خیر آج تو چھڑا لے مگر یہ تو بتا کہ) یومِ سبع میں بکری کا محافظ کون ہوگا۔ اس دن تو میرے سوائے کوئی اس کا چرواہا نہ ہوگا۔ حضرت نے (یہ واقعہ بیان کرکے) فرمایا کہ اس پر میں یقین رکھتا ہوں اور ابوبکرؓ و عمرؓ (بھی) اس پر یقین رکھتے ہیں۔ آپؐ نے ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرف سے بھی شہادت دی، حالانکہ وہ دونوں اس وقت موجود نہ تھے۔ (۲۱۴۴/۵۱۹، جلد اوّل)۔

(صحیح بخاری، جلد اوّل، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور، حدیث نمبر ۲۱۷۲، باب ۱۴۳۹، ص۹۷۹)

شیطان گوز مارتا ہے

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز کی اذان دی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر گوز مارتا ہوا بھاگتا ہے۔ یہاں تک کہ اذان کی آواز نہیں سنتا۔ پھر جب مؤذّن خاموش ہو جاتا ہے تو سامنے آجاتا ہے۔ پھر جس وقت تکبیر کہی جاتی ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے۔ پھر جب تکبیر کہنے والا سکوت کر لیتا ہے، تو سامنے آجاتا ہے۔ اور (نمازی) آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ فلاں بات یاد کر جو اسے یاد نہ ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ بھول جاتا ہے کہ کس قدر نماز پڑھی۔ ابوسلمہؓ کہتے ہیں کہ جب تم میں سے کسی کو یہ بات پیش آئے تو اسے چاہیئے کہ دو سجدے (سہو کے) کرے۔ ابوسلمہؓ نے حضرت ابوہریرہؓ سے اس کو سنا ہے۔ (۱۱۳۱/۲۷۱، جلد اوّل)

(ایضاً۔ حدیث نمبر ۱۱۴۸، باب ۷۷۵، ص۵۵۱)

(۵) عذاب سے نجات

عذاب میں تخفیف

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ یا مکہ کے باغات میں سے کسی باغ میں تشریف لے گئے تو دو آدمیوں کی آواز سنی جن پر اُن کی

قبروں میں عذاب کیا جاتا تھا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان دونوں پر عذاب کیا جاتا ہے اور کسی بڑی بات میں عذاب نہیں کیا جا رہا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ ہاں (بڑی بات ہے) ان میں سے ایک تو اپنے پیشاب سے نہ بچتا تھا۔ اور دوسرا چغلی کھایا کرتا تھا۔ تو پھر آپ نے ایک شاخ منگائی اور اس کے دو ٹکڑے کئے اور اُن دونوں میں سے ہر ایک کی قبر پر ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ یا رسولؐ اللہ! یہ آپؐ نے کیوں کیا؟ آپؐ نے فرمایا امید ہے کہ جب تک یہ خشک نہ ہو جائیں، ان دونوں پر عذاب کم رہے۔ (۲۰۹/۶۴، جلد اوّل)۔

(ایضاً۔ حدیث نمبر ۲۱۴، باب ۱۵۲، صـ۱۸۵)

زنا کے باوجود جنت

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس ایک آنے والا میرے پروردگار کے پاس سے آیا اور اس نے مجھے خبر دی یا یہ فرمایا کہ مجھے بشارت دی کہ جو شخص میری امت میں سے اس حال میں مرے گا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو۔ وہ جنت میں ہوگا۔ میں نے عرض کیا۔ اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور اگرچہ چوری کی ہو۔ آپؐ نے فرمایا اگرچہ زنا کیا ہو۔ اگرچہ چوری کی ہو۔ (۱۱۴۷/۲۷۶، جلد اوّل) (ایضاً۔ حدیث نمبر ۱۱۶۵، باب ۷۸۵، صـ۵۵۹)

اگر گناہ نہ کرو گے تو......

اس مقام پر ایک حدیث صحیح مسلم کی بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اس حدیث کو مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنے ترجمہ و تفسیر (ترجمان القرآن، جلد اوّل، صـ۱۰۹، شائع کردہ زمزم کمپنی۔ لاہور) میں درج کیا ہے۔ ترجمہ انہی کا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔

> اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلب گاری کرے۔

بنی اسرائیل چوہے ہیں

حضرت ابوہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ ایک گروہ بنی اسرائیل کا کھو گیا۔ نہیں معلوم کیا ہوا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ چوہے وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹ کا دودھ رکھ دیا جاتا ہے تو وہ نہیں پیتے اور جب ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ پی لیتے ہیں۔ (۵۲۱/۱۳۹، جلد دوم) (صحیح بخاری، جلد دوم، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور، حدیث نمبر ۵۳۲، باب ۲۹۸، صـ۲۷۶)

بنی اسرائیل نہ ہوتے تو.....

حضرت ابوہریرہؓ نبی (صلعم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اور اگر حوّا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ (۵۵۴/۱۴۳۔ جلد دوم)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۵۵۵' باب ۳۰۲' صـ ۲۸۴)

مکھّی گر جائے تو.....

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی (صلعم) نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کے (کھانے) پینے کی چیز میں مکھی گر جائے تو اسے چاہیئے کہ اس کو غوطہ دے دے۔ بعد اس کے اس کو نکال ڈالے کیونکہ اس کے دو پروں میں سے ایک پر میں بیماری ہے اور دوسرے میں شفا ہے۔ (۵۴۴/۱۴۰۔ جلد دوم)' (ایضاً' حدیث نمبر ۵۴۵' باب ۳۰۰' صـ ۲۷۹)

مُرغ فرشتے کو دیکھتا ہے

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی (صلعم) نے فرمایا کہ جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ سے اس کا فضل طلب کرو۔ کیونکہ وہ فرشتے کو دیکھتا ہے (تب بولتا ہے) اور جب تم گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے خدا کی پناہ مانگو۔ کیونکہ جب وہ شیطان کو دیکھتا ہے تب بولتا ہے۔ (۵۲۹/۱۳۹، جلد دوم)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۵۳۰' باب ۲۹۸' صـ ۲۷۵)

آفتاب کہاں سے نکلتا ہے

حضرت ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا (صلعم) نے فرمایا کہ تم اپنی نمازیں نہ طلوعِ آفتاب کا وقت آنے دو اور نہ غروبِ آفتاب کا۔ اس لئے کہ آفتاب شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان میں طلوع ہوتا ہے۔

(۵۰۲/۱۳۴' جلد دوم)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۵۰۲' باب ۲۹' صـ ۲۶۶)

بخار کیسے ہوتا ہے

حضرت رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی (صلعم) کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ بخار جہنّم کے جوش سے (پیدا ہوتا ہے)۔ لہٰذا، تم اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو۔ (۴۹۲/۱۳۲' جلد دوم)' (ایضاً۔ حدیث نمبر ۴۹۴' باب ۲۹۴' صـ ۲۶۳)۔

پیشاب پینے کا حکم

انسؓ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ عکل یا عرینہ کے آئے۔ مگر وہ مدینہ میں مریض ہوگئے تو آپؐ نے انہیں چند اونٹنیوں کے دینے کا حکم دیا اور یہ کہ وہ لوگ ان کا پیشاب اور ان کا دودھ پیئں۔ پس وہ جنگل میں چلے گئے (اور ایسا ہی کیا)۔ جب اچھے ہوگئے

تو نبی (صلعم) کے چرواہے کو قتل کر ڈالا۔ اور جانوروں کو ہانک کر لے گئے۔ پس دن کے اوّل وقت یہ خبر نبی (صلعم) کے پاس آئی۔ اور آپ نے ان کے تعاقب میں آدمی بھیجے۔ پس دن چڑھے وہ گرفتار کر کے لائے گئے۔ پس آپؐ نے حکم دیا تو ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ ڈالے گئے اور ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں کی گئیں اور گرم سنگلاخ پر ڈال دیئے گئے۔ پانی مانگتے تھے تو انہیں پانی نہیں پلایا جاتا تھا۔ (۲۲۵/۶۷، جلد اوّل)' (صحیح بخاری' مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ' لاہور' حدیث نمبر ۲۳۱' باب ۱۶۴' صفحہ ۱۹۰)

بندر کو سنگسار کیا عمرو بن میمونؒ کہتے ہیں کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا کہ بہت بندر اس کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ اس نے زنا کیا تھا تو اسے ان سب نے سنگسار کیا۔ میں نے بھی ان کے ساتھ اسے سنگسار کیا۔ (۱۰۲۵/۲۶۱، جلد دوم)' (صحیح بخاری' جلد دوم' مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ' لاہور' حدیث نمبر ۱۰۳۱' باب ۴۴۲' صفحہ ۵۰۱)۔

جنّ حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ نبی (صلعم) نے فرمایا۔ آج کی رات میرے پاس ایک جنّ آیا (یا کچھ ایسا ہی لفظ کہا) تاکہ نماز میں خلل ڈالے۔ اللہ نے مجھے اس پر قدرت دی (میں غالب آیا) اور میں نے ارادہ کیا کہ مسجد کے کسی ستون سے اس کو باندھ دوں۔ تاکہ تم لوگ صبح دیکھ لو ...... حضورؐ نے اس جن کو خوار کر کے چھوڑ دیا۔ (۱۹۱۲/۵۶۹، جلد دوم)' (صحیح بخاری' جلد دوم' مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ' لاہور' حدیث نمبر ۵۱۲' باب ۲۹۵' صفحہ ۲۶۹)

حرفِ آخر

یہ نمونہ ہے ان احادیث کا جو بخاری شریف میں درج ہیں۔ اس میں اس قسم کی اور بہت سی احادیث ہیں۔ ان احادیث میں سے اگر کسی ایک کا بھی انکار کیا جائے تو ان حضرات کے نزدیک آپ کافر ہو جاتے ہیں۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ کیا اس قسم کی احادیث اس قابل ہیں کہ ان کے متعلق یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ فی الواقعہ رسولؐ اللہ کے ارشادات ہیں۔

اس قسم کی ہیں وہ احادیث جن کے انکار کرنے پر طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔

اور اسی قسم کی ہیں وہ احادیث جن کو پیش کر کے، مخالفینِ اسلام حضور نبیِ اکرمؐ کی ذات گرامی کو (معاذ اللہ) موردِ طعن و تشنیع ٹھہراتے ہیں۔ طلوعِ اسلام ان سے کہتا ہے کہ یہ احادیث ہمارے رسولؐ کی ہیں ہی نہیں۔ اس لئے حضورؐ کا دامن اس قسم کے اعتراضات سے پاک ہے اور یہ ہے اس کا وہ جرم جس کی پاداش میں اسے دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔

ایک خط اور اُس کا جواب

ہم چاہتے تھے کہ کتاب کے آخر پر، ان مباحث کا خلاصہ درج کر دیا جائے جو سابقہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گذر چکے ہیں۔ "مقامِ حدیث" کے پہلے ایڈیشن میں، اس موضوع پر ایک خط شائع ہوا تھا جو پرویز صاحب کے ایک اہلِ علم دوست نے انہیں لکھا تھا۔ اور اس کے بعد ان کا جواب بھی درج کر دیا گیا تھا ہم سمجھتے ہیں کہ ان مباحث کو مختصر الفاظ میں سامنے لانے کے لئے یہ خط و کتابت بہترین ذریعہ ہے۔ پہلے ہم اس اس خط کے خلاصہ میں سے وہ حصہ شائع کرتے ہیں جس کا تعلق قرآن اور حدیث سے ہے اور اس کے بعد پرویز صاحب کے جواب کا متعلقہ حصہ (ان کی نظرثانی کے بعد)۔ امید ہے آپ اسے مفید پائیں گے۔

پرویز صاحب کے نام خط کا ملخص

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ کے بنیادی مسلمات یہ ہیں۔

(۱) اسلام کے تمام اصول قرآن سے اخذ کئے جائیں۔

(۲) قرآن کی کسی آیت کو منسوخ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

(۳) صحاح ستہ کی حدیثوں میں بہت سی حدیثیں موضوع ہیں۔ اس لئے حدیثوں اور روایتوں پر بحیثیت مجموعی کوئی اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور ان سے اصولِ دین بنانے کا کام نہیں لیا جاسکتا۔

(۴) جو حدیثیں قرآن کے مطابق ہوں انہیں صحیح سمجھا جا سکتا ہے اور جو قرآن کے خلاف ہوں وہ یقیناً موضوع ہیں۔

مجھے نمبر ۲ اور ۴ سے بالکلیہ اتفاق ہے۔ نمبر ۱ اور نمبر ۳ سے متعلق عرض ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں حضرت رسالتمآبؐ خاتم النبیین ہیں اور آیندہ کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ تو کیا چھٹی صدی عیسوی سے لے کر قیامت تک جتنی ضروریات نوعِ انسانی کی مدنی، سیاسی، اقتصادی، عمرانی زندگی میں درپیش ہوں گی۔ ان سب کے اصول قرآن میں درج ہیں؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے لئے قوانینِ حیات کا سب سے پہلا سرچشمہ قرآن ہے اور حتی الامکان اسی سے تمام قوانین اخذ کرنے چاہئیں۔ لیکن انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بے شمار مسائل جو پیدا ہوئے ہیں یا آئندہ ہوں گے، ان سب کے لئے قرآن میں صریحی احکام نہیں ملتے۔ میرے نزدیک قرآن کا کام قوانین وضع کرنا نہیں بلکہ واضعانِ قوانین پیدا کرنا ہے۔ اسلام کا بنیادی اصول صرف ایک ہے۔ یعنی توحید، لیکن بحث اس اصول سے نہیں بلکہ زندگی کے قوانین سے ہے جن کو شریعت بھی کہا جا سکتا ہے۔

اسلام نے نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق فوری قوانین ضرور بنائے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی، یا شاید قرآن کو قانون سازی کی مثال پیش کرنا تھی۔ لیکن ان ضروریات کے لئے جو بعد میں پیش آئیں، قوانین بنانے پر قرآن نے کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ اگر کوئی امتناع ہو تو اجتہاد بے معنی ہو جائے۔ لہٰذا اگر قرآن میں تمام ضروریات کے لئے قوانین نہیں اور قوانین سازی کی اجازت ہے تو قرآن کے بعد رسول اللہ صلعم کے قول و فعل سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ رسولِ خدا قرآن کی رُو سے بدرجۂ اولیٰ واقف تھے اور جو قوانین انہوں نے بنائے وہ ہمارے لئے واجب الاطاعت ہیں۔ کیونکہ انہوں نے قرآن کا جو مفہوم لیا ہے وہی صحیح ہے، اور آپ ہم جو مفہوم اس کے برخلاف لے رہے ہیں وہ غلط ہے۔ البتہ جہاں قرآن یا اس کے بعد، رسول اللہؐ کے قول و فعل میں بھی کسی مسئلہ کا حل نہیں ملتا تو پھر ظاہر ہے کہ ملت کو خود ہی غور و فکر کر کے قانون بنانا پڑے گا۔

اگر یہ صحیح ہے تو فرمائیے کہ رسول اللہؐ کے اقوال و افعال آپ کہاں تلاش کیجئے گا؟ وہ بہرصورت احادیث اور روایات میں ہی ملیں گے۔ اندریں حالات آپ احادیث سے کیسے انکار کر سکتے ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ صحاحِ ستہ میں موضوع حدیثیں شامل ہو گئی ہیں، امام بخاریؒ انسان تھے ان سے بقول ئے بشریت انتخاب میں سہو ممکن تھا۔ لیکن اس کا مداوا یہ تو نہیں کہ سرے سے تمام مجموعۂ احادیث کو ٹھکرا دیا جائے۔ کسی انسان کے بعض اعضا ناقص ہوں تو اسے قتل تو نہیں کر دیا جاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ احادیث و روایات سے استناد ناگزیر ہے۔ خود آپ

نے "معراجِ انسانیت" میں ایسا کیا ہے۔ آپ سوچئے تو کہ اگر احادیث اور روایات سے انکار کر دیا جائے تو پھر خود قرآن کے متعلق شبہات پیدا ہو جائیں گے۔ آخر یہ بھی تو روایات ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ رسولِ کریمؐ نے قرآن کو موجودہ شکل میں ترتیب دیا۔

میرے خیال میں آپ اور آپ کے ہم خیال حضرات اپنی غیر معمولی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو اس پر صرف کریں کہ صحاحِ ستہ میں کون سی روایتیں موضوع ہیں۔ حدیثوں سے بحیثیتِ مجموعی انکار کرنے سے جن نئے فتنوں کے سر اٹھانے کا اندیشہ ہے وہ اس طرح رفع ہو جائے گا اور بہت سے پرانے فتنے بھی مٹ جائیں گے

آپ چونکہ احادیث سے انکار کرتے ہیں، شاید اس لئے آپ کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ قرآن کے معانی و مطالب صرف قرآن ہی سے اخذ کئے جائیں۔ آپ اس دعوے پر دلیل قرآنی آیت "اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ" سے لاتے ہیں۔ فرمایئے اس آیت سے انسانوں کے ذریعہ یہ کام لینے کا مفہوم کیوں نہیں نکلتا؟ آپ نے دیکھا کہ کس طرح ذاتی رجحان خاص معنی پیدا کرتا ہے؟ آپ سابقہ مفسرین پر جو الزام لگا رہے ہیں۔ آپ خود بھی اس سے بالکل بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ ایک معمولی انسان کو جو حاملِ وحی نہ ہو، اپنی فہم و فراست سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایسے میں قرآن کے ان مقامات سے متعلق خصوصی مشکل پیدا ہوتی ہے جن کا مفہوم واضح نہیں۔ مثلاً "ھو اللہ احد" کے مفہوم میں پوری اسلامی تاریخ میں اختلاف واقع نہیں ہو سکا۔ اس کے برعکس "لکم دینکم ولی دین" وغیرہ آیات میں اکثر اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر آپ اسے تسلیم کرتے ہیں تو ان تنقیحات کا آپ کیا جواب دیجئے گا۔

(۱) کیا قرآن کی تمام آیتوں کا مفہوم اسی طرح واضح ہے جیسے ھو اللہ احد کا؟

(۲) اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر ان آیتوں کے متعلق اختلافِ رائے کیوں ہوا؟ حالانکہ ھو اللہ احد کے معانی میں کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

(۳) اگر (۱) کا جواب نفی میں ہے تو پھر ایماندارانہ اختلافِ رائے کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یعنی قرآن ہی سے متبادل معنی اخذ کرنا ممکن ہے یا نہیں، خواہ یہ امکان محض علمی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔؟

(۴) اگر متبادل معانی کا امکان ہو تو کیا دو مطلب صحیح ہوں گے؟ یا ایک صحیح اور دوسرا غلط۔ جب دونوں معانی قرآن سے اخذ کئے گئے ہوں گے تو صحت و عدم صحت کا معیار کیا ہو گا؟

(۵) جب یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کا مطلب قرآن ہی سے اخذ کیا جائے تو کیا اس سے مراد یہ ہے کہ قرآنی الفاظ (مثلاً خمر، میسر وغیرہ) کے معانی قرآن میں تلاش کئے جائیں یا اس زمانہ کی مروّجہ عربی کتابوں میں؟ اگر ان کتابوں

میں متعدد معانی دیئے ہوں تو اس صورت میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

(۶) اگر انحصار اس کا عربی زبان پر ہی رکھا جائے تو قرآن کے زمانے کے اہلِ زبان قرآن کو بہتر سمجھ سکتے ہیں یا آج کے؟

(۷) کیا ان حالات میں یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآنی الفاظ کے معانی معلوم کرنے کے لئے رسول اللہؐ ' ان کے صحابہؓ اور ان کے جانشینوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے؟ (اسے تقلید پرستی پر محمول نہ کیجئے گا. میں چاہتا ہوں کہ آخر کوئی معیار تو ہو جس کے مطابق ہم کہہ سکیں کہ جو مفہوم ہم لے رہے ہیں وہ صحیح ہے)۔

اندریں حالات میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ احادیث کی چھان بین کیجئے اور صحیح اور موضوع کو الگ الگ کر دیجئے۔

جواب

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس کی ہدایت قیامت تک نافذالعمل رہے گی. ظاہر ہے کہ اس قسم کے ضابطۂ ہدایت میں ہر قسم کے مسائل و معاملات کے لئے جزئی اور فرعی احکام نہیں دیئے جا سکتے تھے. اس لئے قرآنی ہدایت کا اسلوب یہ ہے کہ اس نے

(۱) وہ تمام محکم اصول بیان فرما دیئے ہیں جن کے ماتحت انسانی معاشرہ کے لئے تمام قوانین بنائے جا سکتے ہیں. چونکہ زمانہ کے بدلنے سے انسانی معاملات کی تفاصیل میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اس لئے ان اصولوں کے ماتحت جو جزئیات مدوّن کی جائیں گی وہ بھی حالات کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی. لہٰذا قرآن کریم کے ان اصولوں کے تحت ہر زمانہ کی ملّتِ اسلامیہ اپنے لئے جزئیات خود متعین کرے گی. ان جزئیات کی تدوین میں وہ ان جزئیات سے مدد لے سکتی ہے جو اس سے پہلے مدوّن ہوئی ہوں. یعنی وہ جزئیات ان کے لئے نظائر (PRECEDENTS) کا کام دیں گی۔

(۲) قرآن نے بعض امور سے متعلق جزئی احکام بھی خود ہی متعین کر دیئے ہیں. یہ جزئیات بھی ناقابلِ تغیّر و تبدّل ہیں اس لئے کہ قرآن میں ردّ و بدل کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

آپ یہ فرماتے ہیں کہ جن احکام کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں ان جزئیات کے لئے ہمیں احادیث کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور اگر وہاں سے جزئیات مل جائیں تو انہیں قیامت تک کے لئے اسی طرح ناقابلِ تغیّر و تبدل سمجھ

لینا چاہیئے جس طرح ان جزئیات کو جن کا تعین قرآن نے خود کر دیا ہے. میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ قرآن نے جزئیات کے تعین میں اس قسم کی تفریق کیوں کی. یعنی ایسا کیوں کیا کہ بعض احکام کی جزئیات خود متعین کر دیں اور دوسرے احکام کی جزئیات کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر چھوڑ دیا. اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی متعین فرمودہ جزئیات کو قرآنی جزئیات کی طرح قیامت تک واجب الاتباع (یعنی ناقابلِ تغیر و تبدل) رہنا تھا تو قرآن نے ان جزئیات کو بھی خود ہی کیوں نہ متعین کر دیا؟ اس طرح یہ سب جزئیات ایک ہی جگہ مذکور اور محفوظ ہو جاتیں. کیا اللہ تعالیٰ ان جزئیات کو خود متعین نہیں کر سکتا تھا؟ کیا ان سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا؟ قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ سینکڑوں مرتبہ " اٰتُوا الزَّکٰوۃ" کا حکم دہرائے چلا جاتا ہے. کیا وہ کسی ایک آیت میں اتنا نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کی شرح اڑھائی فیصد ہے. اس نے زنا، مبادی زنا، حتٰی کہ بہتان تراشی کی سزاؤں کا تعین خود کر دیا. کیا وہ خمر اور میسرہ (شراب اور قمار بازی) کی سزاؤں کے متعلق بھی دو لفظ نہیں لکھ سکتا تھا؟ اس نے وضو کا پورا طریقہ ایک ہی آیت میں بیان کر دیا. حتٰی کہ تیمّم تک کی تشریح کر دی کہ اس سے مراد کیا ہے. اس نے وراثت جیسے وسیع موضوع کے متعلق چار آیتوں میں تمام تفاصیل کو اس طرح سمیٹ کر رکھ دیا کہ اس مسئلہ کی کوئی شق ایسی نہیں جس کے لئے ان احکام سے ہدایت نہ مل جاتی ہو. ذرا سوچئے کہ اگر قرآن کے پیشِ نظر یہ ہوتا کہ (مثلاً زکوٰۃ کی شرح قیامت تک کے لئے ناقابلِ تبدیل رہنی چاہیے' تو اس کے لئے اڑھائی فیصد کا ذکر کر دینا کون سی دشواری رکھتا تھا؟ میں اسے سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر خدا کا منشاء یہ ہوتا کہ زکوٰۃ کی شرح قیامت تک کے لئے اڑھائی فیصد ہونی چاہیئے تو اس نے اسے قرآن میں خود کیوں نہ بیان کر دیا؟ اس سے ہم ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ منشائے خداوندی تھا ہی نہیں کہ زکوٰۃ کی شرح ہر زمانے میں ایک ہی رہے. آپ نے جو کچھ لکھا ہے' اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کا منشاء تو تھا کہ زکوٰۃ کی شرح قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہے' لیکن اس نے یہ شرح خود متعین کرنا مناسب نہیں سمجھا. بلکہ اس کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر چھوڑ دیا اور جو شرح حضورؐ نے متعین فرما دی وہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل ٹھہرا دی گئی.

خدا نے خود ہی ایسا کیوں کر دیا؟

اب آگے بڑھیئے. آپ فرماتے ہیں کہ جہاں قرآن یا اس کے بعد رسول اللہؐ کے قول و فعل میں بھی کسی مسئلہ کا حل نہیں ملتا. پھر تو اس صورت میں ملّت کو خود ہی غور و فکر کر کے قانون بنانا پڑے گا. اس کا مطلب

یہ ہوا کہ

(۱) قرآن نے بعض احکام کی جزئیات متعین کر دیں اور باقی احکام کو غیر متعین چھوڑ دیا تاکہ اس کی جزئیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متعین فرما دیں۔

(۲) رسول اللہ نے بھی ان میں سے بعض احکام کی جزئیات متعین فرما دیں اور بقایا احکام کو ویسے ہی چھوڑ دیا، اب ان بقایا احکام کی جزئیات امت کو خود متعین کرنی ہوں گی، یعنی دین نہ تو خدا کی طرف سے مکمل ہوا اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تکمیل فرمائی۔ کچھ تصریحات خدا نے کر دیں۔ کچھ خدا کے رسول نے اور

نامکمل دین!

باقی ناتمام حصہ امت کے لئے چھوڑ دیا۔ ذرا غور فرمائیے کہ دین کا یہ مفہوم انسان کے سامنے کیا تصور پیدا کرتا ہے؟ اگر خدا نے ان جزئیات کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ پر چھوڑا تھا تو رسول اللہ کے لئے کون سا امر مانع تھا کہ آپ تمام احکام کی جزئیات متعین فرما دیتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بالعموم اہلِ فقہ آگے بڑھتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا اور رسول کے اس قسم کے ناتمام احکام کی تکمیل ائمہ فقہ نے کر دی ہے۔ لہٰذا جن احکام کی جزئیات نہ قرآن میں ملیں، نہ حدیث میں، انہیں ائمہ فقہ کے فیصلوں سے حاصل کرنا چاہیئے اور اگر کوئی بات ائمہ فقہ کے ہاں سے بھی نہ ملے تو........؟

غور فرمایا آپ نے کہ قرآن کے ایک اصولی نکتہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دینے سے امت کتنی پیچیدگیوں میں اُلجھ گئی اور پیچیدگیوں نے فکر و عمل میں کس طرح انتشار پیدا کر دیا۔ یہ بات صرف اتنی تھی کہ خدا نے جن احکام کی تفصیل خود متعین نہیں کی تھی وہ دانستہ متعین نہیں کی تھی اور اس لئے متعین نہیں کی کہ وہ ان جزئیات کو جامد نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان اصولوں کے تحت زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق نئی نئی جزئیات متعین ہوتی رہیں۔ ورنہ اگر خدا کا منشاء یہ ہوتا کہ یہ جزئیات بھی غیر متبدل رہیں تو اس نے جس طرح دوسرے بعض احکام کی جزئیات کو خود متعین کر دیا تھا۔ ان احکام کی جزئیات کا متعین کرنا اس کے لئے کچھ دشوار نہ تھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متعین فرمودہ جزئیات قیامت تک کے لئے واجب الاتباع ہیں تو ان جزئیات کو کہاں سے تلاش کیا جائے؟ یہی سوال تو میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ یہ فرماتے ہیں کہ یہ جزئیات احادیث کے موجودہ مجموعوں میں ملیں گی۔ لیکن اس کے ساتھ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ احادیث

اُمت کہاں تلاش کرے؟

کے موجودہ مجموعوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور موضوع بھی۔ آپ سوچئے کہ یہ بات کیا ہوئی۔ خدا نے جزئیات کا تعین رسول اللہ

پر چھوڑا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بقول آپ کے) تمام جزئیات کو متعین نہیں فرمایا۔ اور جن جزئیات کو متعین فرمایا انہیں قرآن کی طرح محفوظ کر کے امت کو دیا نہیں۔ اب فرمائیے کہ یہ جزئیات جن کا اتباع قیامت تک کے لئے واجب تھا، امت کہاں سے تلاش کرے؟ سوچئے کہ کیا کسی مکمل ضابطۂ قانون کی صورت یہی ہوا کرتی ہے کہ اسے واجب الاتباع قرار دیا جائے قیامت تک کے لئے اور اس کا کوئی مستند مجموعہ مرتب نہ کیا جائے؟ میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلعم کی متعین فرمودہ جزئیات کو اسی طرح قیامت تک کے لئے واجب الاتباع اور ناقابلِ تغیر و تبدل رہنا تھا، تو کیا رسولؐ اللہ کا یہ فریضہ نہیں تھا کہ جس طرح حضورؐ نے قرآن کو لکھوا کر (اور حفظ یاد کرا کر) ایک مستند مجموعہ کی صورت میں امت کو دیا، اسی طرح اپنی متعین فرمودہ جزئیات کا بھی مستند مجموعہ مرتب فرما کر امت کو دیتے؟ غور فرمائیے کہ اس نظریہ کے ماتحت خود رسول اللہ صلعم کی ذاتِ گرامی کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے؟ دین کا امت تک پہنچانا قرآن کی رُو سے رسولؐ کا اوّلین فریضہ ہوتا ہے۔ کیا دین کے اتنے بڑے جزء کے متعلق یہ طریق اختیار کرنا کہ اس کا کوئی مستند مجموعہ امت کو نہ دیا جائے، کس طرح فریضۂ ابلاغِ دین کی ادائیگی کہلا سکتا ہے؟ احادیث کی رُو سے تو نماز تک کی بھی کوئی ایک شکل متعین نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کے مختلف فرقے مختلف طریق سے نماز ادا کرتے ہیں، اور ہر فرقہ نماز کی اپنی شکل کو رسولؐ اللہ کی متعین فرمودہ شکل قرار دیتا ہے۔ کیا احادیث کی رُو سے یہ ممکن ہے کہ نماز کی کوئی ایسی شکل متعین کی جا سکے جسے تمام فرقے یقینی طور پر رسولؐ اللہ کی مقرر کردہ شکل تسلیم کر لیں!

آپ رسول اللہ صلعم کی ان جزئیات کو قیامت تک کے لئے واجب الاتباع اور ناقابلِ تغیر و تبدل قرار دیتے ہیں اور ان کے متعلق فرماتے یہ ہیں کہ یہ احادیث کے موجودہ مجموعوں میں موجود ہیں اور ان مجموعوں کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ ان میں موضوع حدیثیں بھی شامل ہیں۔ ان کے جامعین (امام بخاری وغیرہم علیہم الرحمۃ) انسان تھے۔ ان سے بہ تقاضائے بشریت سہو ممکن تھا اور اس مشکل کا حل یہ تجویز فرماتے ہیں کہ پرویز اور اس کے ہم خیال ان مجموعوں کی چھان بین کریں اور صحیح حدیثوں کو موضوع حدیثوں سے الگ کریں۔

ایک نئی تجویز

میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ امام بخاریؒ انسان تھے اور ان سے بہ تقاضائے بشریت انتخاب میں سہو ممکن تھا تو کیا پرویز اور اس کے رفقاء فوق البشر ہیں کہ ان سے اس انتخابِ جدید میں سہو ممکن نہیں ہوگا؟ سہو کے امکان اور عدمِ امکان کو چھوڑیئے۔ میں پوچھتا ہوں کہ امام بخاری علیہ الرحمۃ کے پاس کون سی Authority تھی جس کی بنا پر وہ کہہ سکتے تھے کہ یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حکم جس کا اتباع تمام اُمت کے لئے قیامت

تک کے لئے واجب ہے اور آج پرویز یا کسی دوسرے انسان کے پاس وہ کون سی اتھارٹی ہے جس کی بنا پر وہ اس قسم کا دعوے کر سکیں؟ حدیثوں کو واجب الاتباع مان کر یہ کہنا کہ صاحبانِ علم کو چاہیئے کہ وہ صحیح حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کریں، بالواسطہ یہ کہنا ہے کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ سے چوک ہو گئی کہ انہوں نے اپنے ارشاداتِ گرامی کا کوئی مجموعہ امت کو نہ دیا اور جو بات انہیں کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن انہوں نے نہ کی، وہ اب علمائے امت کو کرنی چاہیئے۔

میرے محترم بھائی! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو اس سے بہت بلند سمجھتا ہوں کہ ان کے متعلق یہ خیال تک بھی دل میں لایا جائے کہ حضورؐ کو فریضۂ ابلاغِ دین کے متعلق ایک کام کرنا چاہیئے تھا لیکن اسے حضورؐ نے سرانجام نہیں دیا اور اس کمی کو امام بخاری علیہ الرحمۃ کی سعی ناتمام نے پورا کرنے کی کوشش کی اور جو کچھ ان سے بھی رہ گیا اسے آج کسی اور فرد یا افراد کے مجموعہ سے پورا کرانے کی کوشش کی جائے۔ کم از کم میں تو اپنے اندر اس تصور کی جرأت نہیں پاتا۔ میری رُوح اس تصور سے لرزتی ہے۔ میرا دل اس خیال سے کانپتا ہے۔ میرا ایمان یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلعم یہ سمجھتے کہ حضورؐ کی مرتب فرمودہ جزئیات کو قیامت تک کے لئے واجب الاتباع (یعنی غیر متبدل) رہنا ہے تو حضورؐ کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ ان ارشاداتِ گرامی کا ایک مجموعہ مرتب فرما کر اُمت کو دے جاتے۔ دین کو انفرادی کوششوں کا محتاج بنا دینا، دین کے دینے والے (خدا) اور دین کے پہنچانے والے (رسولؐ) کے خلاف (معاذ اللہ) بہت بڑا اتہام ہے۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ

(۱) جن جزئیات کو خدا نے خود متعین نہیں کیا ان کے متعلق خدا کا منشا یہی تھا کہ وہ ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہیں۔ اور

(۲) جن جزئیات کو رسولؐ اللہ نے متعین کیا ان کے متعلق حضورؐ کا بھی یہ منشا نہیں تھا کہ وہ قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل رہیں۔ اسی لئے حضورؐ نے انہیں محفوظ کر کے امت کے سپرد نہیں کیا۔ بلکہ ان کی کتابت کو بھی روک دیا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچیئے کہ حدیث کے انکار اور اقرار کی وہ صورت پیدا ہی نہیں ہوتی جو آپ کے ذہن میں ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی مجموعہ حدیثوں کے موجودہ مجموعوں میں سے انتخاب کر کے مرتب بھی کر لیا جائے تو اس کے متعلق کس طرح یہ کہا جا سکے گا کہ وہ یقینی طور پر رسولؐ اللہ کے احکام ہیں۔ لہٰذا تمام مسلمانوں کو ان کا اتباع کرنا چاہیئے اور ان کے علاوہ جن حدیثوں کو ہم نے موضوع قرار دے دیا ہے ان کا اتباع ترک کر دینا چاہیئے۔ ذرا سوچیئے کہ دین کسے کہتے ہیں؟ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دین کا حکم ہے کہ فلاں رشتہ دار کو متوفی کی جائیداد

میں سے اتنا حصہ ملنا چاہیئے. اگر کوئی شخص اس کے مطابق ترکہ کی تقسیم نہیں کرتا تو ہمارے ایمان کے مطابق وہ خدا کی معصیت کا مرتکب ہوتا ہے اور سزا کا مستوجب. کیا اتنے بڑے اہم معاملے کے لئے ضروری نہیں کہ ہمیں یقینی طور پر معلوم ہو کہ اس باب میں دین کا حکم کیا ہے؟ یقین ہی تو وہ شے ہے جس پر تمام دین کا دار و مدار ہے.

یقین پر دین کا مدار ہے

فرمایئے کہ آپ کے پاس کوئی ذریعہ ایسا ہے جس سے آپ یقینی طور پر کہہ سکیں کہ فلاں بات فی الواقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح فرمائی تھی؟ جس قسم کا مجموعۂ حدیث آپ مرتب کروانا چاہتے ہیں اس کے متعلق بھی تو آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکیں گے کہ ہمارا قیاس یہ ہے کہ رسول اللہ نے اس قسم کی بات فرمائی ہوگی. کہیئے کہ آپ کا یا میرا قیاس امت کے کروڑوں افراد کے لئے واجب الاتباع کیسے ہو سکتا ہے؟ بنا بریں حدیثوں کا کوئی مجموعہ دین نہیں بن سکتا. البتہ وہ ہمارے اسلاف کی علمی کوششوں کا نتیجہ ہے اور ہم اس متاع کے وارث ہیں. ہم ان علمی کوششوں کے ذریعہ اس دور کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتے ہیں. حدیثوں کی اس افادی حیثیت سے نہ مجھے کبھی انکار تھا نہ انکار ہو سکتا ہے. میں ان سے کس قدر مستفید ہوا ہوں اس کے متعلق آپ نے خود لکھ دیا کہ اس پر میری تالیف "معراجِ انسانیت" شاہد ہے.

اگلی بات تک پہنچنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں سمجھنا یہ چاہتا ہوں کہ

(۱) اگر تمام احکام کی جزئیات کا قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل رکھا جانا مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے تمام احکام کی جزئیات خود قرآن میں کیوں متعین نہ کر دیں؟ اور

(۲) اگر رسول اللہ کا منشا تھا کہ آپ کی متعین فرمودہ تمام جزئیات قیامت تک کے لئے واجب الاتباع ہیں، تو حضورؐ نے ان جزئیات کا ایک مستند مجموعہ اسی طرح امت کو کیوں نہ دیا جس طرح قرآن دیا تھا؟

باقی رہا یہ سوال کہ اگر احادیث کو نہ مانا جائے تو پھر قرآن کے متعلق بھی یہ شبہات پیدا ہو جائیں گے. اس کے متعلق اتفاق سے طلوعِ اسلام کی ستمبر ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں کسی صاحب کے استفسار کے جواب میں ایک تفصیلی شذرہ شائع ہو چکا ہے. امید ہے کہ اس باب میں آپ کے اطمینان کا باعث ہو جائے گا۔[1] (لیکن خود

---

[1] قرآنِ مجید اسی شکل میں جس میں وہ آج امت کے پاس ہے، خود رسول اللہ نے لکھوا کر، مرتب کر کے، محفوظ صورت

(بقیہ فٹ نوٹ آئندہ صفحہ پر)

روایات سے قرآن کے متعلق جو تصوّر پیدا ہوتا ہے اس کا ذکر پہلے آچکا ہے)۔

قرآن کا مفہوم

آپ کا دوسرا سوال قرآن کے مفہوم و معانی کو متعیّن کرنے کے متعلق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی کتاب کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلی چیز اس کتاب کی زبان کا سمجھنا ہے۔ قرآن، عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ اس کا دعوے ہے کہ وہ اپنے مطالب میں بڑا واضح اور غیر مبہم ہے۔ اس لئے زبان کے اعتبار سے قرآنِ مجید کے سمجھنے میں کوئی دشواری لاحق نہیں ہوسکتی۔

زبان کے بعد قرآن کے متن کو لیجئے۔ مقصدِ پیشِ نظر کی رُو سے قرآن کی تعلیم کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصّہ احکام سے متعلق ہے اور دوسرا علوم سے۔ احکام کا حصّہ چونکہ قانون سے متعلق ہے اس لئے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مفہوم متعیّن ہو۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنا مفہوم خود متعیّن کرتا ہے اور تصریفِ آیات (یعنی مختلف آیات کو دہرانے) سے اس مفہوم کی وضاحت کر دیتا ہے۔ اس لئے قرآن نے اپنے احکام کا مفہوم واضح طور پر متعیّن کر دیا ہے۔ میں نے قرآن کو اسی انداز میں سمجھا ہے اور میں اپنے دل کے پورے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ اس باب میں نہ کوئی الجھن باقی رہتی ہے نہ پیچیدگی۔ نہ اختلاف نہ تضاد۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ قرآن بعض احکامات کو صرف اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور بعض کی جزئیات بھی خود متعیّن کر دیتا ہے۔ لیکن اصول ہوں یا جزئیات، قرآن کی بات بالکل واضح اور متعیّن شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ ان احکام کو قانون کی زبان اور ان کے حدود و شرائط کے ساتھ ایک ضابطہ کی شکل میں نافذ کرنا ہر دَور کی اسلامی حکومت کا کام ہے۔ قرآن اس قانون کو انفرادی تفقہ پر نہیں چھوڑتا بلکہ اسلامی حکومت کے سپرد کرتا ہے اور وہیں کی تعبیر تمام ملّت کے لئے واجب التعمیل سمجھی جاتی ہے

قانون سازی

مثلاً آپ نے خمر (شراب) اور میسرہ (قماربازی) کا ذکر فرمایا ہے۔ پہلے زبان کے اعتبار سے لیجئے تو خمر اصولاً عقل کو ڈھانپ دینے والی چیز ہوگی اور میسرہ ہر وہ شے جو بلا محنت آسانی سے ہاتھ آجائے۔ اب لیجئے ان کی متعیّن شکل، سو نزولِ قرآن کے زمانے میں خمر (شراب) اور میسرہ (قماربازی) کی مختلف صورتیں موجود تھیں جن کی تفصیل اس زمانے کے لٹریچر میں ملتی ہے۔ اس سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس زمانے میں ان کی کیا کیا شکلیں رائج تھیں۔ آج ان میں بعض اشکال

(سابقہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) میں دیا تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں"۔
(شائع کردہ طلوعِ اسلام ٹرسٹ)

باقی ہیں، بعض مٹ چکی ہیں اور کئی نئی نئی شکلیں ظہور میں آ چکی ہیں۔ لہٰذا جو اسلامی حکومت آج خمر اور میسر کو ممنوع قرار دے گی، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ان اصولی اور مجازی معانی کی روشنی میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے واضح طور پر بتائے کہ خمر اور میسرہ کی DEFINITIONS کیا ہیں؟ کون کون سی چیزیں ان میں شامل ہیں اور کون کون سی شکلیں مستثنیٰ۔ اس باب میں وہ حکومت ان تفصیلات سے بھی مدد لے گی جو ان امور کے متعلق سابقہ ادوار میں طے پائی تھیں۔ یہی قانون ان الفاظ کی صحیح تعبیر ہوگی۔ اس میں نہ صحیح اور غلط کا سوال باقی رہتا ہے، نہ میری یا کسی اور کی تعبیر کا۔ باقی رہا قرآن کا وہ حصہ جو علوم سے متعلق ہے تو ظاہر ہے کہ جوں جوں علمِ انسانی ترقی کرتا چلا جائے گا اس حصے کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن کے الفاظ میں یہ اعجاز ہے کہ وہ ہر دور اور ہر ذہنی سطح کے انسان کے لئے روشنی کا کام دیتا ہے۔ جوں جوں علمِ انسانی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ، جن کا تعلق حقائق عالم سے ہے، اپنے وسیع سے وسیع تر معانی کھولتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ہر دور کا انسان، قرآنی حقائق کا مفہوم اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ اسی لئے اس باب میں کسی شخص کا فہمِ قرآن، نہ کسی اپنے ہم عصر کے لئے حجت ہو سکتا ہے نہ آنے والے دور کے انسانوں کے لئے سند یا حرفِ آخر۔

نبوت اور رسالت

باقی رہا قرآن کریم کا وہ مفہوم جسے حضور نبی اکرمؐ نے سمجھایا۔ سو اسے حضورؐ نے مرتب فرما کر امت کو نہیں دیا۔ اور جو کچھ اس سلسلے میں حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس کا نمونہ سابقہ صفحات میں سامنے آ چکا ہے۔ اسے کسی طرح بھی رسول اللہؐ کا قرآن نہیں کہا جا سکتا۔

جو کچھ کہا گیا اسے ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجئے۔

(۱) قرآنِ کریم کے جو احکام متعیّن شکل میں دیئے گئے ہیں، انہیں اسی طرح نافذ کیا جائے گا۔

(۲) اس نے جو احکام اصولی شکل میں دیئے ہیں ان کی تفاصیل متعیّن کرنا ہر زمانے کی اسلامی حکومت کا فریضہ ہوگا جو خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت کے نمونے کی ہوگی۔

(۳) قرآنی علوم و حقائق کا مفہوم علمِ انسانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ اور یہ چیز انفرادی فکر و تدبر سے متعلق ہوگی۔ لیکن کسی کی فکر کسی دوسرے کے لئے سند اور حجت نہیں ہوگی۔

(۴) اب رہا یہ سوال کہ جب تک خلافت علیٰ منہاجِ نبوت (اسلامی حکومت) کا دوبارہ قیام نہیں ہو جاتا، اس وقت تک کیا کیا جائے۔ سو اس باب میں میرا مسلک یہ ہے کہ امت جس جس طریقہ سے ان احکام پر کاربند چلی آ رہی ہے، وہ اس پر کاربند رہے۔ میں خود ان احکام پر اسی طرح کاربند رہتا ہوں۔ اس لئے کہ کسی فرد یا افراد کے گروہ کو اس کا حق نہیں کہ وہ ان احکام میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے۔ یہ حق صرف خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کو حاصل ہے۔ جس کی مرکزی اتھارٹی کو میں "مرکزِ ملت" کہہ کر پکارا کرتا ہوں، جیسے حضرت ابو بکرؓ صدیق اس زمانے میں مرکزِ ملت تھے۔

وَالسَّلام